جلد ۷۵ — فروری ۱۹۷۳ء — عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابو الاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ضروری اعلان

ماہنامہ "ترجمان القرآن" کے خریدار اور ایجنٹ حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ ترجمان القرآن کی اشاعت کے لیے جتنا کاغذ کا کوٹہ ماہوار درکار ہوتا ہے، پرمٹ پر اُتنا نہیں ملتا۔ جس کی وجہ سے باقی کاغذ بازار سے گراں نرخ پر خرید کر پرچے کی مطلوبہ تعداد پوری کرنی پڑتی ہے۔

اِس لیے مجبوراً ہمیں پرچے کی قیمت میں اضافہ کرنا پڑا۔ لہٰذا ماہ دسمبر سنہ ۷۲ء سے قیمت فی پرچہ ایک روپیہ اور سالانہ چندہ دس ۱۰/ روپے کر دیا گیا ہے۔

منیجر "ترجمان القرآن"

اچھرہ۔ لاہور

ترجمان القرآن ، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۸	فروری ۱۹۷۳ء مطابق محرّم ۱۳۹۳ ھ	عدد ۶

ادارۂ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور

چندہ سالانہ ـــ دس روپے

فی پرچہ ـــ ایک روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن ، اچھرہ - لاہور سے شائع کیا

پرنٹر : محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

یہ حقیقت اگرچہ اپنی جگہ بڑی تلخ اور اندوہناک ہے مگر اس سے کسی صورت بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان میں دستور سازی کی تاریخ ایک مسلسل اور عظیم المیہ ہے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب یہ ملک معرضِ وجود میں آیا تو اس وقت ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کو ہی عبوری دستور کے طور پر اپنایا گیا اور مجلس دستور کو یہ فرض سونپا گیا کہ وہ اہلِ پاکستان کے قومی تقاضوں کے مطابق دستور کی تدوین کرے مگر پاکستان کے چھپے ہوئے دشمنوں نے اس خطۂ پاک کی نظریاتی بنیاد کے بارے ہی میں عوام کے اندر مختلف قسم کے شکوک و شبہات پیدا کرنے شروع کر دیئے لیکن ان فتنہ پردازوں کو اپنے مذموم مقصد میں کوئی خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی اور ۱۹۴۹ء کی قراردادِ مقاصد کے ذریعے، جسے پاکستان کی عدالتِ عظمیٰ نے اپنے ایک حالیہ فیصلے میں پاکستان کی اساس تسلیم کیا ہے، یہ بات ہمیشہ کے لیے طے ہو گئی کہ اس ملک کا دستور اسلامی ضابطۂ حیات کا ہر لحاظ سے ترجمان ہو گا۔ اس قراردادِ مقاصد کے بعد بھی اسلام دشمن طاقتیں اس ملک کو اسلام کی راہ سے ہٹانے میں اپنا پورا زور صرف کرتی رہیں۔ مگر ان کی کوششوں کے علی الرغم دستور سازی کا کام کسی نہ کسی طور آگے بڑھتا رہا تا آنکہ ۱۹۵۴ء میں ایک ایسا دستور تیار ہو گیا جس میں اگر چند مناسب تبدیلیاں کر دی جاتیں تو یہ دستور اہلِ پاکستان کی قومی ضروریات اور تقاضوں کو کافی حد تک پورا کر سکتا تھا۔ اس فیصلہ کن مرحلے پر ایک سر پھرے اور آمرانہ مزاج رکھنے والے گورنر جنرل کو خدا جانے کیا سوجھی کہ اس نے دستور ساز اسمبلی کو ہی توڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تدوینِ دستور کے معاملے میں جو کام ہو چکا تھا وہ بالکل غارت ہو کر رہ گیا اور یہ ملک زمین بے آئین ہونے کی وجہ سے بڑی سُرعت کے ساتھ آمریت کے مہیب غاروں کی طرف لڑھکنے لگا۔ پھر ۱۹۵۶ء میں ایک نئی دستور ساز اسمبلی بلائی گئی جس نے ملک میں آئینی خلا کے خطرات کو اچھی طرح بھانپتے ہوئے بڑی مستعدی کے ساتھ ایک ایسا آئین تیار کر لیا جو ۱۹۵۴ء کے مسودۂ دستور سے کافی بہتر تھا اور جسے پوری قوم بعض ترامیم کے ساتھ قبول کرنے پر بالکل آمادہ تھی اور یہ توقع پیدا ہو گئی تھی کہ عنقریب ملک میں اس دستور کا نفاذ ہو گا اور اس کے فوراً بعد اس کی بنیاد پر نئے انتخابات منعقد ہوں گے اور اس طرح اہلِ پاکستان کے قافلے نے قراردادِ مقاصد کی صورت میں اپنے لیے جو سمت

متعین کی ہے اس کی طرف وہ دستور کی تیار کردہ راہ پر بڑی تیزی کے ساتھ گامزن ہو سکے گا۔ مگر افسوس کہ توقعات کے یہ خیالی خاکے حقیقت کا رنگ بھرنے سے پہلے ہی سکندر مرزا اور ایوب خان کے آمرانہ عزائم کی وجہ سے خواب پریشاں ہو کر رہ گئے اور ملک مارشل لا کے تسلط میں آ گیا۔ سکندر مرزا نے ملک کا اقتدار فوج کے حوالے کرتے ہوئے بڑے دل نشیں الفاظ میں اس بات کا اعلان کیا تھا کہ جلد ہی ملک کے ذہین اور محب الوطن افراد کو جمع کر کے ان کے سپرد یہ کام کیا جائیگا کہ وہ ایک ایسا دستور تیار کریں کہ جو مسلم قوم کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہو اور جب یہ دستور تیار ہو جائیگا تو پھر اسے قوم کے سامنے رائے کے لیے پیش کیا جائے گا۔ اور آخر کار استصواب رائے کے بعد اس کا ملک میں نفاذ ہوگا لیکن ہماری بدقسمتی کہ ان میں سے کوئی ایک وعدہ بھی پورا نہ کیا گیا۔

پہلے چار سال تک تو فیلڈ مارشل صاحب مارشل لا کے بل بوتے پر ملک میں من مانی کارروائیاں کرتے رہے اور ۱۹۶۲ء میں ملک کو جو دستور عطا کیا اس کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نہ تھا کہ صدر صاحب کی آمریت کو کسی طرح دستور کی سندِ جواز حاصل ہو جائے اور وہ اپنی آمرانہ اور مطلق العنان سرگرمیوں کو مارشل لا کے نام پر جاری رکھنے کے بجائے دستور اور جمہوریت کے نام پر جاری رکھ سکیں۔ یہ دستور درحقیقت پاکستانی قوم کے لیے کوئی دستور نہ تھا بلکہ فیلڈ مارشل ایوب صاحب کے خسروانہ اختیارات کا محض ایک پروانہ تھا جو خود انہوں نے قوم کے نام جاری فرمایا یعنی بزرجمہروں نے اس دستور کی تدوین کی انہوں نے اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا کہ اس ملک میں قوت و اختیار کا مرکز و محور صرف صدر صاحب کی ذات ہو۔ اور ساری قوم ان کی مرضی کی اس طرح تابع ہو جس طرح کہ بھیڑوں کا گلہ گلہ بان کی لاٹھی کا تابع ہوتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ صدر صاحب کے ان لامحدود اختیارات کے اس شاہی فرمان کو اس ملک کا قانون بنانے کے لیے اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ استصواب رائے کے ذریعے اس کے بارے میں عوام کے ردِ عمل کو معلوم کر لیا جاتا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ فرمانِ شاہی کی طرح اسے قصرِ صدارت سے جاری کر دیا گیا۔ اور اس ضمن میں کسی فرد یا گروہ کی رائے معلوم کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی گئی بلکہ اس کے ساتھ قوم کے نام یہ فرمان بھی جاری ہوا کہ اگر زبان کھولو تو اس کی تعریف و توصیف میں کھولو، ورنہ خاموش رہو۔ اس دستور میں صدر ایوب صاحب نے اپنے لیے ایسے وسیع اختیارات حاصل کر لیے تھے کہ اگر ان کی بجائے کوئی دوسرا صدر ہوتا اور پھر ان سے یہ پوچھا جاتا کہ کیا وہ کسی دوسرے صدر کو بھی اس قدر لامحدود اختیارات دینے کے لیے تیار ہیں تو وہ کبھی بھی ایسی دھاندلی کو قبول کرنے کے لیے

آمادہ نہ ہوتے مگر اپنے لیے انہوں نے ان اختیارات کو بالکل جائز سمجھا۔ چنانچہ اس دستور کا وہی حشر ہوا جو عام طور پر خود پسند اور حریص فرمانرواؤں کی احمقانہ کوششوں کا ہوتا ہے کہ یہ دستور بھی اکبر کے دینِ الٰہی کی طرح ایوب صاحب کے تختِ اقتدار سے ہٹتے ہی دفن ہو گیا۔

اسے اس ملک کی بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے موجودہ فرمانرواؤں نے اپنے پیشرووں کے انجام سے قطعاً کوئی سبق حاصل نہیں کیا بلکہ وہ اسی غلطی کے ارتکاب پر مُصر ہیں جو پہلے حکمران کر چکے ہیں اور جس کی وجہ سے یہ ملک ابھی تک سرزمینِ بے آئین ہونے کی بنا پر طوائف الملوکی کا شکار ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آمرانہ مزاج رکھنے والے ان اصحابِ اقتدار کو لامحدود اختیارات کے چھوٹ پن نے حقائق سے اس حد تک غافل کر دیا ہے کہ وہ اتنی سادہ سی بات بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جس دستور میں حاکم و محکوم کے مابین اختیارات کی تقسیم عدل و انصاف کی بنیاد پر نہ ہو گی آخر اس ظالمانہ دستور کو عوام کس طرح خوش دلی کے ساتھ قبول کر سکیں گے۔ جو لوگ علم سیاست کا معمولی علم بھی رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک اچھے دستور کو جن خوبیوں کا حامل ہونا ضروری ہے ان میں ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ دستور اس نوعیت کا ہو کہ ملک کی عظیم اکثریت اسے خوشدلی کے ساتھ قبول کرے اور اس کی پابندی اس پر شاق نہ گزرتی ہو۔ ظاہر بات ہے کہ یہ وہی دستور ہو سکتا ہے جو معاشرے کے مختلف طبقوں کے درمیان عدل و انصاف کا ضامن ہو۔ اور کسی قوم کے مزاج اور اس کی اجتماعی امنگوں سے اس حد تک مطابقت رکھتا ہو کہ عوام اس دستور کی ایک ایک شق کو اپنی آرزوؤں کا مظہر اور اپنے دل کی پکار خیال کرتے ہوں۔ مگر ہمارے اس ملک کے دستور سازوں نے تدوینِ دستور کے معاملے میں ان بنیادی حقائق کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ایک ایسا دستوری مسودہ تیار کیا ہے جو نہ تو قومی عزائم کا آئینہ دار ہے اور نہ تقسیم اختیارات کے معاملے میں انصاف اور توازن کا ضامن، البتہ اس میں ایک شخصیت کا پرتو ہر زاویۂ نگاہ سے اور ہر مقام پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اور یوں دکھائی دیتا ہے کہ یہ دستور کسی قوم کو تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے تیار نہیں کیا گیا بلکہ صدر بھٹو صاحب کے لامحدود اختیارات کو دستوری تحفظ دینے کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ دستور بھی ۱۹۶۲ء کے دستور کی طرح کسی لحاظ سے بھی ہماری قوم کا دستور کہلانے کا مستحق نہیں بلکہ صدر بھٹو صاحب کی شخصیت کے گرد ایک ہالہ ہے جس کا مقصد محض ان کی ذات کو نمایاں کرنا اور اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک لوگوں کو یہ تاثر دینا ہے کہ اس ملک کے سیاسی اُفق

پر صرف ان کی ذاتِ گرامی ہی جھلملا رہی ہے باقی یہاں تاریکی ہی تاریکی ہے۔ موجودہ حالات میں دستور سازی صدر بھٹو صاحب کی ذات کی کسی حد تک تابع ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ جب صدر بننے پر مصر تھے تو سارے اختیارات صدر کے ہاتھ میں سمیٹ دینے کا التزام کیا گیا تھا اور اب جبکہ انہوں نے پارلیمانی نظام کے تحت وزیر اعظم بننا گوارا کیا ہے تو اختیارات کی ساری باگیں وزیر اعظم کے ہاتھ میں دے دی گئی ہیں۔ مسودۂ دستور کے مطابق صدر کا منصب محض ایک آرائشی منصب بن کر رہ گیا ہے۔ ذوالفقار علی صاحب کو بحیثیت وزیر اعظم وہ سارے اختیارات حاصل ہیں جن کا مطالبہ صدارتی نظام میں وہ بحیثیت صدر کر رہے تھے، بجز اس ایک بات کے کہ وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہونے سے وہ ۲۱ توپوں کی سلامی سے محروم ہو جائیں گے۔ باقی جہاں تک اختیارات کی وسعت کا تعلق ہے وہ ایوب خان صاحب کے اختیارات سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر وزیر اعظم کے اس منصب پر کسی دوسرے شخص کے فائز ہونے کے امکانات ہوں اور انہیں صدارت کے موجودہ اختیارات کے ساتھ منصبِ صدارت سنبھالنے کے لیے کہا جاتے تو وہ کبھی اس پر آمادہ نہ ہونگے کیونکہ انہوں نے وزارتِ عظمیٰ کے عہدے کو جن اختیارات سے مزین کیا ہے وہ درحقیقت وزارتِ عظمیٰ کے اختیارات نہیں بلکہ اپنی ذات کے اختیارات ہیں۔

کسی قوم کے ساتھ اس سے زیادہ شرمناک مذاق اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُسے جمہوریت کا فریب دے کر دستور کے ایسے دام میں پھنسا یا جائے جس کا ہر حلقہ اپنے اندر آمریت کی پُوری شدت اور سختی رکھتا ہو اور جس کے تحت عوام اپنے آپ کو اس قسم کی جکڑ بندیوں میں بے بس محسوس کرنے لگیں جس طرح کی جکڑ بندیوں کا کسی فسطائی اور آمرانہ نظام میں تصور کیا جاسکتا ہے۔ محض انتخابات کا ڈھونگ رچا دینے سے تو کسی نظام کو جمہوری نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ان انتخابات کا ڈھونگ تو فاشسٹ ممالک میں بھی وقتاً فوقتاً رچایا جاتا ہے مگر یہ محض ڈھونگ ہی ہوتا ہے۔

آپ مسودۂ دستور پر اگر اچٹتی ہوئی نگاہ بھی ڈالیں تو آپ پر یہ حقیقت پُوری طرح منکشف ہو جائے گی کہ اس دستور کی ترتیب و تدوین میں جو کاوش ہوئی ہے اس کا واحد مقصد یہی رہا ہے کہ کسی طرح بھٹو صاحب کو وزیر اعظم کے منصب پر فائز ہوتے ہوئے ایسے وسیع اختیارات حاصل ہو جائیں جو ہٹلر، مسولینی اور لینن اور سٹالن تک

کو حاصل نہ تھے اور جن کے حصول کی آرزو میں ہمارے ملک کے کئی سربراہ بہت آزما رہے اور اس کی تکمیل کے لیے انہوں نے ملک کی سلامتی تک کو داؤ پر لگا دینے سے تامل نہ کیا۔

عوامی حقوق کے معاملے میں یہ کس قدر ناانصافی بلکہ عوامی حقوق کی یہ کس قدر پامالی ہے کہ اسمبلی میں بالکل سادہ اکثریت سے منتخب ہونے والا وزیراعظم جب ایک مرتبہ وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر براجمان ہو جاتے تو پھر اسمبلی کے وہی ارکان اسے معزول نہ کر سکیں جب تک کہ وہ دو تہائی یعنی ۲۰۰ میں سے ۶۶ ارکان اس کے عزل پر متفق نہ ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وزیراعظم منتخب ہو جانے کے بعد ۶۶ کے مقابلے میں ۱۳۴ ارکان کی تائید سے وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر فائز رہنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اسے اس صریح غیر منصفانہ حق کے علاوہ یہ حق بھی حاصل ہے کہ اگر دو تہائی ارکانِ اسمبلی بھی اسے اس منصب سے ہٹانے پر متفق ہو جائیں تو وہ اس عدمِ اعتماد کا اس وقت تک اسمبلی میں اظہار نہیں کر سکتے جب تک کہ وزارتِ عظمیٰ کے عہدے کے لیے کوئی متبادل نام پیش نہ کریں۔

یہ مشکل اور صبر آزما مرحلہ بھی صرف وزیراعظم کی رضامندی سے ہی طے ہو سکتا ہے کیونکہ اسے دستور کی رُو سے یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اسمبلی کو توڑ کر تنہا حکومت کرتا رہے تا آنکہ نئے سرے سے عام انتخابات ہوں اور نئی اسمبلی معرضِ وجود میں آئے۔ وزیراعظم کے اس اختیار کے مقابلے میں ارکینِ اسمبلی کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ اسمبلی کو توڑ کر نئے سرے سے انتخابات کرا سکیں۔

پھر صدر وزیراعظم کے سامنے کس قدر کمزور اور بے بس ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب وزیراعظم صدر کو اسمبلی توڑنے کا مشورہ دے یا دوسرے الفاظ میں حکم دے تو صدر پر دو روز کے اندر اس حکم کی تعمیل لازم ہے۔ اور اگر وہ اس معاملے میں تاخیر کرے تو وزیراعظم خود ہی اسمبلی کو توڑ دینے کا مجاز ہے۔ وزیراعظم کے اس قسم کے اختیارات کی مثال دنیا کے کسی جمہوری ملک میں نہیں ملتی۔

اس مسودہ دستور میں نہ صرف صدر کو وزیراعظم کا تابع بنایا گیا ہے بلکہ اسے عدلیہ پر بھی غیر معمولی برتری اور فوقیت دینے کا انتظام کیا گیا ہے۔ ۱۹۵۶ء کے آئین کے مطابق پاکستان کی عدالت عظمیٰ کو نہ صرف عدالت عالیہ کے فیصلوں پر نظرثانی کا اختیار حاصل تھا، بلکہ ماسوائے فوجی عدالتوں کے ان فیصلوں کے جو وہ پاکستان کی مسلح افواج کے ارکان کے بارے میں صادر کرتی تھیں باقی ہر سطح اور ہر نوعیت کی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف

عدالتِ عظمیٰ کی طرف رجوع کیا جاسکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یُوں کہا جا سکتا ہے کہ اُس دستور کے مطابق پاکستان کے ہر شہری کو اس بات کا حق حاصل تھا کہ وہ ظلم و نا انصافی کی صورت میں عدالتِ عظمیٰ کا دروازہ کھٹکھٹائے اور اس عدالت کو اس امر کا اختیار تھا کہ اس کے مظلوم ہونے کی صورت میں اس کی داد رسی کرے۔ ۱۹۶۲ء کے آئین میں عدالتِ عظمیٰ کے ان وسیع اختیارات میں کسی حد تک کمی کر دی گئی مگر اُس دستور میں بھی عدالت کے اس منصب کو بہر حال تسلیم کیا گیا کہ وہ دستور کی نگہبان اور عوام کے بنیادی حقوق کی محافظ ہوگی اور جب بھی کسی شخص کا بنیادی حق سلب ہو رہا ہو تو وہ اس کی طرف رجوع کرنے کا مجاز ہو۔ مگر اس نئے مسودۂ دستور میں عبوری آئین کی دفعہ ۲۱۶ کو شامل کر کے عدالت کے دائرۂ اختیار پر ضربِ کاری لگائی گئی ہے۔ دستور میں بظاہر عوام کو بنیادی حقوق سے نوازا گیا ہے مگر عدالت کے ذریعے ان کے تحفظ کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ نئے دستور کی رُو سے جس وقت مرکزی اسمبلی خاص ایکٹ کے ذریعے چند انتظامی عدالتیں قائم کر دیگی اس وقت مندرجۂ ذیل نوعیت کی نا انصافیاں صرف ان عدالتوں کے سامنے ہی پیش کی جاسکیں گی اور ملک کی دوسری اعلیٰ عدالتیں ان نا انصافیوں کے تدارک کے معاملے میں عضوِ معطل کی حیثیت اختیار کر لیں گی۔

——جب ملازمت میں کسی شخص کے ساتھ نا انصافی ہوئی ہو۔

——جب حکومت نے کسی شہری پر نا جائز ظلم کیا ہو یا کسی فرد یا گروہ پر جرمانے یا تاوان کا ناجائز بوجھ ڈالا ہے۔

——جب کسی شخص کی جائداد ضبط کی گئی ہو یا اسے فروخت کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہو۔

معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا آدمی بھی اس حقیقت کو جانتا ہے کہ حکومت کی طرف سے شہریوں پر جو مظالم ڈھائے جاتے ہیں وہ ان تینوں نوعیتوں کے مظالم ہی ہوتے ہیں۔ اب اگر ملک کا عام شہری ملک کی ان اونچی عدالتوں کی طرف رجوع کرنے کا مجاز نہ ہوگا تو آخر اُن انتظامی عدالتوں سے کیا انصاف حاصل ہو سکے گا۔ جو خاص ایکٹ کے ذریعے اور مخصوص مقاصد کے پیشِ نظر قائم کی جائینگی۔ اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اس قسم کی عدالتوں کے قیام کے لیے وہ اسمبلی قانون پاس کرے گی جس کا اپنا وجود وزیر اعظم کی رضامندی کا رہینِ منت ہوگا۔ کیا ایسی بے جان مقننہ سے اِس بات کی کوئی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ایسی عدالتوں کے قیام میں کامیاب ہو جو عوام کے بنیادی حقوق کے تحفظ کی خاطر برسرِ اقتدار طبقے کے مقابلے میں سینہ سپر ہونے کا حوصلہ اور عزم رکھتی ہوں۔

سرکاری ملازمین کا طبقہ کسی ملک کے وجود کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو انسانی جسم میں ریڑھ کی ہڈی کی ہوتی ہے۔ اگر یہ طبقہ جاندار اور دیانتدار ہو تو یہ ملک کو بسا اوقات بڑے ہولناک طوفانوں سے بچا کر ساحلِ مراد پہ لے جاتا ہے۔ دورِ حاضر میں فرانس اور جاپان میں اس طبقے نے جو تعمیری کردار ادا کیا ہے اس پر پوری دنیا گواہ ہے۔ ان ممالک میں مختلف سیاسی گروہوں کے مابین اقتدار کی رسہ کشی نے ایک ایسے خوفناک خلفشار کی صورت اختیار کرلی تھی جس سے ان ممالک کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا تھا مگر وہاں کی دانشمند، مستعد اور محبّ الوطن انتظامیہ نے اپنے بے مثال تدبّر اور عزمِ راسخ سے نہ صرف جاپانی اور فرانسیسی قوم کو برباد ہونے سے بچایا بلکہ اس خلفشار کو دور کرکے ملک کے اندر اعتدال اور امن و امان کی ایک فضا قائم کی جس میں وہاں کے عوام تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن ہوتے۔ جب کسی ملک میں لگاتار سیاسی طوفان اٹھنے لگیں اور اجتماعی زندگی کی ناؤ ان کے اندر گھر کر ہچکولے کھانے لگے تو باہمت انتظامیہ لنگر کا کام دیتی ہے اور اسے طوفان کی نذر ہونے سے بچاتی ہے۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے کسی غیر معمولی ذہانت اور فطانت کی ضرورت نہیں کہ انتظامیہ یہ فرض اسی صورت میں بطریقِ احسن سرانجام دے سکتی ہے جب اسے اپنی ملازمت کا تحفظ حاصل ہو اور اگر وہ اس احساسِ تحفظ سے محروم ہو جائے، پھر نہ تو وہ معاشرے کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا کام دے سکتی ہے اور نہ سیاسی خلفشار کے اندر قوم کی کشتی کے لیے لنگر ثابت ہو سکتی ہے بلکہ اس کی حیثیت موم کی ناک اور خس و خاشاک کی سی ہوتی ہے جسے معمولی سا دباؤ جس رخ چاہتا ہے بڑی آسانی کے ساتھ موڑ کر رکھ دیتا ہے اور سیاسی طوفان کی معمولی لہریں بھی جس طرف چاہتی ہیں اسے بہا کر لے جاتی ہیں۔ اس بنا پر ملکی استحکام کے لیے یہ ضروری تھا کہ دستور میں انتظامیہ کے لیے واضح تحفظات کا التزام کیا جاتا تاکہ وہ اطمینان اور سکون کے ساتھ ملک کی انتظامی مشنری کو سیاسی تغیرات کے علی الرغم چلانے میں مصروف رہتی۔ لیکن ہمارے ہاں انتظامیہ کے اندر احساسِ تحفظ پیدا کرنے کے بجائے اس کے دل و دماغ پر خوف و ہراس کی مستقل کیفیت طاری کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ صدر بھٹو نے صدارت کے تخت پر براجمان ہوتے ہی سب سے پہلا یہ کام کیا کہ چودہ سو افسروں کو بیک بینی دوگوش نکال باہر کیا۔ اور یہ آمرانہ کارروائی اس انداز سے کی گئی جس کی نظیر کسی مہذب ملک میں نہیں ملتی۔ نہ تو ان ملازموں کو ان کے جرم سے آگاہ کیا گیا جس کی پاداش میں انہیں ملازمت سے محروم کیا جا رہا تھا اور نہ انہیں اپنے حق میں صفائی کا کوئی موقع فراہم کیا گیا محض ایک نادرشاہی فرمان کے ذریعے وہ ملازمتوں سے

(باقی صفحہ ۲۶۳ پر)

تفہیم القرآن

الاخلاص

نام اَلْاِخلاص اِس سُورہ کا محض نام ہی نہیں ہے بلکہ اِس کے مضمون کا عنوان بھی ہے، کیونکہ اس میں خالص توحید بیان کی گئی ہے۔ قرآن مجید کی دوسری سُورتوں میں تو بالعموم کسی ایسے لفظ کو اُن کا نام قرار دیا گیا ہے جو اُن میں وارد ہُوا ہو، لیکن اس سُورہ میں لفظ اِخلاص کہیں وارد نہیں ہوا ہے۔ اس کو یہ نام اس کے معنی کے لحاظ سے دیا گیا ہے۔ جو شخص بھی اس کو سمجھ کر اس کی تعلیم پر ایمان لے آئے گا وہ شرک سے خلاصی پا جائے گا۔

زمانۂ نزول اِس کے مکّی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے، اور یہ اختلاف اُن روایات کی بنا پر ہے جو اس کے سببِ نزول کے بارے میں منقول ہوئی ہیں۔ ذیل میں ہم اُن کو سلسلہ وار درج کرتے ہیں:

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نَسَب ہمیں بتائیے۔ اس پر یہ سُورت نازل ہوئی (طَبَرانی)۔

(۲) ابوالعالیہ نے حضرت اُبَیّ بن کعبؓ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب ہمیں بتائیے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سُورۃ نازل فرمائی (مُسنداحمد، ابن ابی حاتم، ابن جریر، ترمذی، بخاری فی التاریخ، ابن المُنذِر، حاکم، بَیہقی)۔ ترمذی نے اِسی مضمون

ؔ اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ جب وہ کسی اجنبی شخص سے تعارف حاصل کرنا چاہتے تو کہتے تھے کہ اِنسِبْہُ لَنَا، اس کا نسب ہمیں بتاؤ۔ کیونکہ اُن کے ہاں تعارف میں سب سے پہلی چیز جو دریافت طلب ہوتی تھی وہ یہی تھی کہ اُس کا نَسَب کیا ہے اور وہ کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھنا چاہا کہ آپ کا رب کون ہے اور کیسا ہے تو انہوں نے کہا: اِنْسِبْ لَنَا رَبَّكَ، اپنے رب کا نَسَب ہمیں بتائیے۔

کی ایک روایت ابوالعالیہ سے نقل کی ہے جس میں حضرت اُبَیّ بن کعبؓ کا حوالہ نہیں ہے اور اُسے صحیح تر کہا ہے

(۳) حضرت جابرؓ بن عبداللہ کا بیان ہے کہ ایک اعرابی نے (اور بعض روایات میں ہے کہ لوگوں نے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب ہمیں بتایئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سُورت نازل فرمائی (ابو یعلیٰ، ابن جریر، ابن المُنذر، طَبرانی فی الاوسط، بَیہقی، ابو نُعیم فی الحِلیہ)۔

(۴) عِکرِمہ نے ابنِ عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ یہودیوں کا ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جس میں کعب بن اشرف اور حُیَیّ بن اَخطب وغیرہ شامل تھے اور انہوں نے کہا "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، ہمیں بتایئے کہ آپ کا وہ رب کیسا ہے جس نے آپ کو بھیجا ہے؟ اِس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سُورت نازل فرمائی (ابن ابی حاتم، ابن عَدِی، بَیہقی فی الاسماء والصفات)۔

اِن کے علاوہ مزید چند روایات ابنِ تیمیہؒ نے اپنی تفسیر سُورۂ اخلاص میں نقل کی ہیں جو یہ ہیں:

(۵) حضرت اَنسؓ کا بیان ہے کہ خیبر کے کچھ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے کہا "اے ابوالقاسم، اللہ نے ملائکہ کو نُورِ حجاب سے، آدم کو مٹی کے سڑے ہوئے گارے سے، ابلیس کو آگ کے شعلے سے، آسمان کو دھوئیں سے، اور زمین کو پانی کے جھاگ سے بنایا، اب ہمیں اپنے رب کے متعلق بتایئے (کہ وہ کس چیز سے بنا ہے)"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر جبرئیلؑ آئے اور انہوں نے کہا اے محمدؐ، اِن سے کہیے هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۔۔۔۔۔۔

(۶) عامر بن الطُّفَیل نے حضورؐ سے کہا "اے محمدؐ، آپ کس چیز کی طرف ہمیں بلاتے ہیں؟" آپ نے فرمایا اللہ کی طرف۔ عامر نے کہا "اچھا تو اُس کی کیفیت مجھے بتایئے۔ وہ سونے سے بنا ہوا ہے یا چاندی سے یا لوہے سے؟" اس پر یہ سُورۃ نازل ہوئی۔

(۷) ضحاک اور قتادہ اور مُقاتِل کا بیان ہے کہ یہودیوں کے کچھ علماء حضورؐ کے پاس آئے اور انہوں نے کہا "اے محمدؐ، اپنے رب کی کیفیت ہمیں بتایئے، شاید کہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں۔ اللہ نے اپنی صفت توراۃ میں نازل کی ہے۔ آپ بتایئے کہ وہ کس چیز سے بنا ہے؟ کس جنس سے ہے؟ سونے سے بنا ہے یا تانبے سے یا پیتل سے، یا لوہے سے یا چاندی سے؟ اور کیا وہ کھاتا اور پیتا ہے؟ اور کس سے اُس نے دنیا وراثت میں پائی ہے اور اُس کے بعد کون اُس کا وارث ہوگا؟" اِس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سُورت نازل فرمائی۔

(۸) ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد سات پادریوں کے ساتھ نبی صلی اللہ

علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے حضورؐ سے کہا "ہمیں بتائیے آپ کا رب کیسا ہے، کس چیز سے بنا ہے؟" آپ نے فرمایا میرا رب کسی چیز سے نہیں بنا ہے، وہ تمام اشیاء سے جُدا ہے۔ اِس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سُورۃ نازل فرمائی۔

اِن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مواقع پر مختلف لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس معبُود کی ماہیت اور کیفیت دریافت کی تھی جس کی بندگی و عبادت کی طرف آپؐ لوگوں کو دعوت دے رہے تھے، اور ہر موقع پر آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُن کو جواب میں یہی سُورت سُنائی تھی۔ سب سے پہلے یہ سوال مکہ میں قریش کے مشرکین نے آپ سے کیا اور اس کے جواب میں یہ سُورت نازل ہوئی۔ اس کے بعد مدینۂ طیبہ میں کبھی یہودیوں نے، کبھی عیسائیوں نے، اور کبھی عرب کے دوسرے لوگوں نے حضورؐ سے اسی نوعیت کے سوالات کیے اور ہر مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ ہوا کہ جواب میں یہی سُورت آپؐ ان کو سُنا دیں۔ اِن روایات میں سے ہر ایک میں یہ جو کہا گیا ہے کہ اِس موقع پر یہ سُورت نازل ہوئی تھی، اس سے کسی کو یہ خیال نہ ہونا چاہیے کہ یہ سب روایتیں باہم متضاد ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی مسئلے کے بارے میں اگر پہلے سے کوئی آیت یا سُورۃ نازل شُدہ موجود ہوتی تھی تو بعد میں جب کبھی حضورؐ کے سامنے وہی مسئلہ پیش کیا جاتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت آجاتی تھی کہ اِس کا جواب فلاں آیت یا سُورۃ میں ہے، یا اس کے جواب میں وہ آیت یا سُورۃ لوگوں کو پڑھ کر سُنا دی جائے۔ احادیث کے راوی اِسی چیز کو یُوں بیان کرتے ہیں کہ جب فلاں معاملہ پیش آیا، یا فلاں سوال کیا گیا تو یہ آیت یا سُورۃ نازل ہوئی۔ اِس کو تکرارِ نزول سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی ایک آیت یا سُورۃ کا کئی مرتبہ نازل ہونا۔

پس صحیح بات یہ ہے کہ یہ سُورۃ دراصل مکّی ہے۔ بلکہ اِس کے مضمون پر غور کرنے سے محسُوس ہوتا ہے کہ یہ مکّے کے بھی ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہے جب اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بیان میں قرآن کی مفصّل آیات ابھی نازل نہیں ہوئی تھیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت الی اللہ کو سُن کر لوگ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آخر آپؐ کا وہ رب ہے کیسا جس کی بندگی و عبادت کی طرف آپ لوگوں کو بُلا رہے ہیں۔ اِس کے بالکل ابتدائی دَور کی نازل شدہ سُورت ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ مکّہ میں جب حضرت بلالؓ کا آقا اُمیّہ بن خلف اُن کو دھوپ میں تپتی ہوئی ریت پر لِٹا کر ایک بڑا سا پتھر اُن کی چھاتی پر رکھ دیتا تھا تو وہ اَحَدٌ اَحَدٌ پکارتے تھے۔ یہ لفظ اَحَد اسی سُورہ سے ماخوذ تھا۔

موضوع اور مضمون | شانِ نزول کے بارے میں جو روایات اُوپر درج کی گئی ہیں اُن پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توحید کی دعوت لے کر اُٹھے تھے اُس وقت دُنیا کے مذہبی تصوّرات کیا تھے۔ بُت پرست مشرکین اُن خداؤں کو پُوج رہے تھے جو لکڑی، پتھر، سونے، چاندی وغیرہ مختلف چیزوں کے بنے ہوتے تھے، شکل، صورت اور جسم رکھتے تھے۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی باقاعدہ نسل چلتی تھی۔ کوئی دیوی بے شوہر نہ تھی اور کوئی دیوتا بے زوجہ نہ تھا۔ اُن کو کھانے پینے کی ضرورت بھی لاحق ہوتی تھی اور اُن کے پرستار اُن کے لیے اس کا انتظام کرتے تھے۔ مشرکین کی ایک بڑی تعداد اِس بات کی قائل تھی کہ خدا انسانی شکل میں ظہور کرتا ہے اور کچھ لوگ اُس کے اَوتار ہوتے ہیں۔ عیسائی اگرچہ ایک خدا کو ماننے کے مدعی تھے، مگر اُن کا خدا بھی کم از کم ایک بیٹا تو رکھتا ہی تھا، اور باپ بیٹے کے ساتھ خدائی میں رُوح القدس کو بھی حصہ دار ہونے کا شرف حاصل تھا، حتیٰ کہ خدا کی ماں بھی ہوتی تھی اور اُس کی ساس بھی۔ یہودی بھی ایک خدا کو ماننے کا دعویٰ کرتے تھے، مگر اُن کا خدا بھی مادّیت اور جسمانیت اور دوسری انسانی صفات سے خالی نہ تھا۔ وہ ٹہلتا تھا۔ انسانی شکل میں نمودار ہوتا تھا۔ اپنے کسی بندے سے کُشتی بھی لڑ لیتا تھا۔ اور ایک عدد بیٹے (عُزیر) کا باپ بھی تھا۔ اِن مذہبی گروہوں کے علاوہ مجوسی آتش پرست تھے اور صابئی ستارہ پرست۔ اِس حالت میں جب اللہ وحدہٗ لاشریک کو ماننے کی دعوت لوگوں کو دی گئی تو اُن کے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہونا ایک لازمی امر تھا کہ وہ رب ہے کس قسم کا جسے تمام ارباب اور معبودوں کو چھوڑ کر تنہا ایک ہی رب اور معبود تسلیم کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ قرآن مجید کا یہ اعجاز ہے کہ اُس نے اِن سوالات کا جواب چند الفاظ میں دے کر اللہ کی ہستی کا ایسا واضح تصور پیش کر دیا جو تمام مشرکانہ تصورات کا قلع قمع کر دیتا ہے اور اُس کی ذات کے ساتھ مخلوقات کی صفات میں سے کسی صفت کی آلودگی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتا۔

فضیلت اور اہمیت | یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں اِس سُورت کی بڑی عظمت تھی اور آپ مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو اس کی اہمیت محسوس کراتے تھے، تاکہ وہ کثرت سے اس کو پڑھیں اور عوام الناس میں اِسے پھیلائیں، کیونکہ یہ اسلام کے اوّلین بنیادی عقیدے (توحید) کو چار ایسے مختصر فقروں میں بیان کر دیتی ہے جو فوراً انسان کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور آسانی سے زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ احادیث میں کثرت سے یہ روایات بیان ہوئی ہیں کہ حضورؐ نے مختلف مواقع پر مختلف

طریقوں سے لوگوں کو بتایا کہ یہ سُورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابنِ ماجہ، مُسند احمد، طبرانی وغیرہ میں اِس مضمون کی متعدد احادیث ابو سعید خُدری، ابوہُریرہ، ابوایوب انصاری، ابوالدرداءؓ، مُعاذ بن جَبل، جابر بن عبداللہ، اُبَی بن کعب، اُمِّ کُلثوم بنت عُقبہ بن ابی مُعَیط، ابنِ عمر، ابنِ مسعود، قَتادہ بن النُّعمان، اَنس بن مالک اور ابو مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے منقول ہوئی ہیں۔ مفسّرین نے حضورؐ کے اِس ارشاد کی بہت سی توجیہات بیان کی ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ قرآن مجید جس دین کو پیش کرتا ہے اُس کی بنیاد تین عقیدے ہیں۔ ایک توحید۔ دوسرے رسالت۔ تیسرے آخرت۔ یہ سُورۃ چونکہ خالص توحید کو بیان کرتی ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک تہائی قرآن کے برابر قرار دیا۔

حضرت عائشہؓ کی یہ روایت بخاری و مسلم اور بعض دوسری کتبِ حدیث میں نقل ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو ایک مُہم پر سردار بنا کر بھیجا۔ اس پُورے سفر کے دوران میں اُن کا مستقل طریقہ یہ رہا کہ ہر نماز میں وہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد پر قرأت ختم کرتے تھے۔ واپسی پر اُن کے ساتھیوں نے حضورؐ سے اس کا ذکر کیا۔ آپؐ نے فرمایا اُن سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اُن سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ اس میں رحمٰن کی صفت بیان کی گئی ہے اس لیے اس کا پڑھنا مجھے بہت محبوب ہے۔ حضورؐ نے یہ بات سُنی تو لوگوں سے فرمایا اخبروه ان الله تعالىٰ يُحبّه "اُن کو خبر دے دو کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں محبوب رکھتا ہے۔"

اِسی سے ملتا جُلتا واقعہ بخاری میں حضرت اَنسؓ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انصار میں سے ایک صاحب مسجدِ قُبا میں نماز پڑھاتے تھے اور اُن کا طریقہ یہ تھا کہ ہر رکعت میں پہلے قل هُوَ اللّٰه پڑھتے، پھر کوئی اور سُورت تلاوت کرتے۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا اور ان سے کہا کہ یہ تم کیا کرتے ہو کہ قُل ہو اللہ پڑھنے کے بعد اسے کافی نہ سمجھ کر کوئی اور سُورت بھی اُس کے ساتھ ملا لیتے ہو؟ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ یا تو صرف اِسی کو پڑھو، اور یا پھر اسے چھوڑ کر کوئی اور سورت پڑھو۔ اُنہوں نے کہا میں اسے چھوڑ نہیں سکتا، تم چاہو تو میں تمہیں نماز پڑھاؤں ورنہ امامت چھوڑ دوں۔ لیکن لوگ اُن کی جگہ کسی اور کو امام بنانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ آخر کار معاملہ حضورؐ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپؐ نے ان سے پوچھا کہ تمہارے ساتھی جو کچھ چاہتے ہیں اُسے قبول کرنے میں تم کو کیا امر مانع ہے؟ تمہیں ہر رکعت میں یہ سُورت پڑھنے پر کس چیز نے آمادہ کیا؟ انہوں نے عرض کیا مجھے اس سے محبت ہے۔ آپؐ نے فرمایا حُبُّكَ اِيَّاهَا اَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ "اِس سُورۃ سے تمہاری محبت نے تمہیں جنت میں داخل کر دیا۔"

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

کہو[1]، وہ اللہ[2] ہے، یکتا[3]۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اُس کے محتاج ہیں[4]۔ نہ اُس کی کوئی
اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد[5]۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے[6]۔ ع اع

---

[1] اِس حکم کے اوّلین مخاطب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کیونکہ آپؐ ہی سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ آپؐ کا رب کون اور کیسا ہے، اور آپ ہی کو حکم دیا گیا کہ اِس سوال کے جواب میں آپ یہ کہیں۔ لیکن حضورؐ کے بعد ہر مومن اس کا مخاطب ہے۔ اُسے بھی وہی بات کہنی چاہیے جس کے کہنے کا حکم حضورؐ کو دیا گیا تھا۔

[2] یعنی میرے جس رب سے تم تعارُف حاصل کرنا چاہتے ہو وہ کوئی اور نہیں بلکہ اللہ ہے۔ یہ اُن سوال کرنے والوں کی بات کا پہلا جواب ہے، اور اِس کا مطلب یہ ہے کہ مَیں کوئی نیا رب لے کر نہیں آگیا ہوں جس کی عبادت دُوسرے سب معبودوں کو چھوڑ کر، مَیں تم سے کروانا چاہتا ہوں، بلکہ وہ وہی ہستی ہے جس کو تم اللہ کے نام سے جانتے ہو۔ "اللہ" عربوں کے لیے کوئی اجنبی لفظ نہ تھا۔ قدیم ترین زمانے سے وہ خالقِ کائنات کے لیے یہی لفظ استعمال کر رہے تھے اور اپنے دوسرے معبودوں میں سے کسی پر بھی اس کا اطلاق نہیں کرتے تھے۔ دوسرے معبودوں کے لیے اُن کے ہاں اِلٰہ کا لفظ رائج تھا۔ پھر اللہ کے بارے میں اُن کے جو عقائد تھے اُن کا اظہار اُس موقع پر خوب کھل کر ہو گیا تھا جب اَبرہہ نے مکّہ پر چڑھائی کی تھی۔ اُس وقت خانۂ کعبہ میں ۳۶۰ اِلٰہوں کے بُت موجود تھے، مگر مشرکین نے اُن سب کو چھوڑ کر صرف اللہ سے دعائیں مانگی تھیں کہ وہ اِس بلا سے اُن کو بچائے۔ گویا وہ اپنے دلوں میں اچھی طرح جانتے تھے کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ اس نازک وقت میں اُن کی مدد نہیں کر سکتا۔ کعبے کو بھی وہ اُن اِلٰہوں کی نسبت سے بَیتُ الآلِہَہ نہیں، بلکہ اللہ کی نسبت سے بیتُ اللہ کہتے تھے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں مشرکینِ عرب کا عقیدہ کیا تھا۔ مثال کے طور پر:

سُورۂ زُخرُف میں ہے: "اگر تم اِن سے پوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے" (آیت ۸۷)۔

سُورۂ عنکبُوت میں ہے: "اگر تم اِن سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سورج کو کس نے مسخر کر رکھا ہے، تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے . . . . اور اگر تم اِن سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے مُردہ پڑی ہوئی زمین کو جِلا اٹھایا، تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے" (آیات ۶۱ تا ۶۳)۔

سورۂ مومنون میں ہے: "اِن سے کہو، بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ یہ زمین اور اِس کی ساری آبادی کس کی ہے؟ یہ ضرور کہیں گے اللہ کی ۔ ۔ ۔ اِن سے پوچھو ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے؟ یہ ضرور کہیں گے اللہ ۔ ۔ ۔ اِن سے کہو، بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ ہر چیز پر اقتدار کس کا ہے؟ اور کون ہے وہ جو پناہ دیتا ہے اور اُس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا؟ یہ ضرور جواب دیں گے کہ یہ بات تو اللہ ہی کے لیے ہے" (آیات ۸۴ تا ۸۹)۔

سورۂ یونس میں ہے: "اِن سے پوچھو، کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں (جو تمہیں حاصل ہیں) کس کے اختیار میں ہیں؟ اور کون زندہ کو مُردہ سے اور مُردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ اور کون اِس نظمِ عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ" (آیت ۳۱)۔

اِسی سورۂ یونس میں ایک اور جگہ ہے: "جب تم لوگ کشتیوں پر سوار ہو کر بادِ موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک بادِ مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے، اُس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اُن سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اِس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکرگزار بندے بنیں گے۔ مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں (آیات ۲۲-۲۳)۔

یہی بات سُورۂ بنی اسرائیل میں یُوں دُہرائی گئی ہے: "جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اُس ایک کے سوا دوسرے جن جن کو تم پکارا کرتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں، مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم اُس سے مُنہ موڑ جاتے ہو" (آیت ۶۷)۔

اِن آیات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ جب لوگوں نے پوچھا کہ وہ تمہارا رب کون ہے اور کیسا ہے جس کی بندگی و عبادت کی طرف تم ہمیں بُلاتے ہو، تو انہیں جواب دیا گیا هُوَ اللهُ، وہ اللہ ہے۔ اِس جواب سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ جسے تم خود اپنا اور ساری کائنات کا خالق، مالک، رازق اور مُدبّر و منتظم مانتے ہو، اور سخت وقت آنے پر جسے دوسرے سب معبودوں کو چھوڑ کر مدد کے لیے پکارتے ہو، وہی میرا رب ہے اور اسی کی بندگی کی طرف میں بلاتا ہوں۔ اِس جواب میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفاتِ کمالیہ آپ سے آپ آجاتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ بات سرے سے قابلِ تصور ہی نہیں ہے کہ کائنات کو پیدا کرنے والا، اُس کا انتظام اور اُس کے معاملات کی تدبیر کرنے والا، اُس میں پائی جانے والی تمام مخلوقات کو رزق دینے والا، اور مصیبت کے وقت اپنے بندوں کی مدد کرنے والا، زندہ نہ ہو، سنتا اور دیکھتا نہ ہو، قادرِ مطلق نہ ہو، علیم اور حکیم نہ ہو، رحیم اور کریم نہ ہو، اور سب پر غالب نہ ہو۔

۳؎ نحوی قواعد کی رُو سے علماء نے هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کی متعدد ترکیبیں بیان کی ہیں، مگر ہمارے نزدیک اُن میں سے جو ترکیب اِس مقام کے ساتھ پُوری مناسبت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ هُوَ مُبتدا ہے، اَللّٰهُ اس کی خبر ہے، اور اَحَدٌ اس کی دوسری خبر۔ اس ترکیب کے لحاظ سے اِس جُملے کا مطلب یہ ہے کہ "وہ (جس کے بارے میں تم لوگ سوال کر رہے ہو) اللہ ہے، یکتا ہے"۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے، اور زبان کے لحاظ سے غلط نہیں ہے کہ "وہ اللہ ایک ہے"۔

یہاں سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اِس جملہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ اَحَد جس طرح استعمال کیا گیا ہے وُہ عربی زبان میں اس لفظ کا غیر معمولی استعمال ہے۔ معمولاً یہ لفظ یا تو مُضاف یا مُضاف اِلَیہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے جیسے یَوْمُ الْاَحَد، ہفتے کا پہلا دن، اور فَابْعَثُوْٓا اَحَدَکُمْ "اپنے کسی آدمی کو بھیجو"۔ یا نفیِ عام کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسے مَا جَاءَنِیْ اَحَدٌ "میرے پاس کوئی نہیں آیا"۔ یا عمومیت کا پہلو لیے ہوئے سوالیہ فقرے میں بولا جاتا ہے، جیسے هَلْ عِنْدَكَ اَحَدٌ؟ "کیا تمہارے پاس کوئی ہے؟" یا اسی عمومیت کے پہلو سے شرطیہ جملہ میں بولا جاتا ہے، جیسے اِنْ جَاءَكَ اَحَدٌ "اگر تمہارے پاس کوئی آئے"۔ یا گنتی میں بولا جاتا ہے، جیسے اَحَد، اِثْنَانِ، اَحَدَ عَشَرَ، ایک، دو، گیارہ۔ اِن استعمالات کے سوا نزولِ قرآن سے پہلے کی عربی زبان میں اِس امر کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ محض لفظ اَحَد وصف کے طور پر کسی شخص یا چیز کے لیے بولا گیا ہو، اور نزولِ قرآن کے بعد یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے استعمال کیا گیا ہے، دوسرے کسی کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔ اِس غیر معمولی طرزِ بیان سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یکتا و یگانہ ہونا اللہ کی خاص صفت ہے، موجودات میں سے کوئی دوسرا اِس صفت سے مُتَّصِف نہیں ہے۔ وہ ایک ہے، کوئی اُس کا ثانی نہیں۔

پھر جو سوالات مشرکین اور اہلِ کتاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے آپ کے رب کے بارے میں کیے تھے اُن کو نگاہ میں رکھتے ہوئے دیکھیے کہ هُوَ اللّٰهُ کہنے کے بعد اَحَدٌ کہہ کر اُن کا جواب کس طرح دیا گیا ہے:

اوّلاً، اِس کے معنی یہ ہیں کہ وہی اکیلا رب ہے، کسی دوسرے کا رُبُوبیت میں کوئی حصّہ نہیں ہے، اور چونکہ اِلٰہ (معبود) وہی ہو سکتا ہے جو رب (مالک و پروردگار) ہو، اس لیے اُلوہیت میں بھی کوئی اُس کا شریک نہیں۔

ثانیاً، اِس کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہی تنہا کائنات کا خالق ہے، تخلیق کے اِس کام میں کوئی اور اُس کا شریک نہیں ہے۔ وہی اکیلا مالک الملک ہے، نظامِ عالم کا مدبّر و منتظم ہے، اپنی مخلوقات کا رزق رساں ہے، اور آڑے وقت میں مدد کرنے والا فریاد رس ہے۔ خدائی کے اِن کاموں میں، جن کو تم خود مانتے ہو کہ یہ اللہ کے کام ہیں، کسی دوسرے

کا قطعاً کوئی حصّہ نہیں ہے۔

ثالثاً، چونکہ اُنہوں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ وہ کس چیز سے بنا ہے؟ اُس کا نسب کیا ہے؟ وہ کس جنس سے ہے؟ کس سے اُس نے دنیا کی میراث پائی ہے؟ اور اُس کے بعد کون اُس کا وارث ہو گا؟ اِس لیے اُن کے اِن سارے سوالات کا جواب بھی اللہ تعالیٰ کے لیے صرف ایک لفظِ اَحَد بول کر دے دیا گیا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ (۱) وہی ایک خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، نہ اُس سے پہلے کوئی خدا تھا، نہ اس کے بعد کوئی خدا ہو گا (۲) خداؤں کی کوئی جنس نہیں ہے جس کا وہ فرد ہو، بلکہ وہ اکیلا خدا ہے اور کوئی اُس کا ہم جنس نہیں (۳) اُس کی ذات محض واحد نہیں بلکہ اَحَد ہے جس میں کسی حیثیت سے بھی کثرت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ وہ اجزاء سے مُرکّب وجود نہیں ہے جو قابلِ تجزیہ و تقسیم ہو، جو کوئی شکل اور صورت رکھتا ہو، جو کسی جگہ میں رہتا ہو یا کوئی چیز اس کے اندر جگہ پاتی ہو، جس کا کوئی رنگ ہو، جس کے کچھ اعضا ہوں، جس کی کوئی سمت اور جہت ہو، اور جس کے اندر کسی قسم کا تغیّر و تبدّل ہوتا ہو۔ تمام اقسام کی کثرتوں سے بالکل پاک اور مُنزّہ وہ ایک ہی ذات ہے جو ہر لحاظ سے اَحَد ہے۔ (اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ عربی زبان میں "واحد" کا لفظ بالکل اُسی طرح استعمال ہوتا ہے جس طرح ہم اُردو میں "ایک" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ بڑی سے بڑی کثرتوں پر مشتمل کسی مجموعہ کو بھی اس کی مجموعی حیثیت کے لحاظ سے واحد یا ایک کہا جاتا ہے، جیسے ایک آدمی، ایک قوم، ایک ملک، ایک دُنیا، حتیٰ کہ ایک کائنات۔ اور کسی مجموعہ کے ہر جُز کو الگ الگ بھی ایک ہی کہا جاتا ہے۔ لیکن اَحَد کا لفظ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔ اِسی لیے قرآنِ مجید میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے واحد کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اِلٰہٌ واحدٌ (ایک ہی معبود) یا اَللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ، اکیلا اللہ جو سب کو مغلوب کر کے رکھنے والا ہے، کہا گیا ہے، محض واحد کہیں نہیں کہا گیا، کیونکہ یہ لفظ اُن چیزوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو اپنی ذات میں طرح طرح کی کثرتیں رکھتی ہیں۔ بخلاف اِس کے اللہ کے لیے اور صرف اللہ ہی کے لیے اَحَد کا لفظ مطلقاً استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ وجود میں صرف وہی ایک ہستی ایسی ہے جس میں کسی حیثیت سے بھی کوئی کثرت نہیں ہے، جس کی وحدانیت ہر لحاظ سے کامل ہے)۔

لہ اصل میں لفظ صَمَد استعمال کیا گیا ہے جس کا مادّہ ص، م، د ہے۔ عربی زبان میں اِس مادّے سے جو الفاظ نکلے ہیں، اُن پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے معانی کی وسعت کس قدر ہے:

—— اَلصَّمْدُ۔ قصد کرنا، بلند مقام جو بڑی ضخامت رکھتا ہو، سطحِ مُرتفع، وہ آدمی جسے جنگ میں بھوک پیاس نہ لگتی ہو، وہ سردار جس کی طرف حاجات میں رجوع کیا جاتا ہو۔

——— اَلصَّمَدُ - ہر چیز کا بلند حصہ، وہ شخص جس سے بالاتر کوئی دوسرا شخص نہ ہو، وہ سردار جس کی اطاعت کی جاتی ہو اور اُس کے بغیر کسی معاملہ کا فیصلہ نہ کیا جاتا ہو، وہ سردار جس کی طرف حاجتمند لوگ رجوع کرتے ہوں۔ دائم، بلند مرتبہ، ٹھوس جس میں کوئی خول یا جھول نہ ہو اور جس سے نہ کوئی چیز نکلتی ہو نہ اس میں داخل ہو سکتی ہو۔ وہ آدمی جسے جنگ میں بھوک پیاس نہ لگتی ہو۔

——— اَلْمُصْمَدُ، ٹھوس چیز جس کا کوئی جوف نہ ہو۔

——— اَلْمُصَمَّدُ، مقصود جس کی طرف جانے کا قصد کیا جائے۔ سخت چیز جس میں کوئی کمزوری نہ ہو۔

——— بَیْتٌ مُصَمَّدٌ، وہ گھر جس کی طرف حاجات میں رجوع کیا جاتا ہو۔

——— بِنَاءٌ مُصْمَدٌ، بلند عمارت۔

——— صَمَدَہٗ وَصَمَدَ اِلَیْہِ صَمْدًا، اُس شخص کی طرف جانے کا قصد کیا۔

——— اَصْمَدَ اِلَیْہِ الْاَمْرَ، اُس کے سپرد معاملہ کر دیا، اُس کے آگے معاملہ پیش کر دیا، اُس کے اوپر معاملہ میں اعتماد کیا۔ (صحاح، قاموس، لسان العرب)

اِن لغوی معنوں کی بنا پر آیت اَللّٰہُ الصَّمَدُ میں لفظ الصَّمَد کی جو تفسیریں صحابہ و تابعین اور بعد کے اہلِ علم سے منقول ہیں اُنہیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

——— حضرت علیؓ، عِکرِمہ اور کَعْب اَحبار: "صمد وہ ہے جس سے بالاتر کوئی نہ ہو"۔

——— حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، اور ابووائل شقیق بن سَلَمہ: "وہ سردار جس کی سیادت کامل ہو اور انتہا کو پہنچی ہوئی ہو"۔

——— ابن عباسؓ کا دوسرا قول: "صمد وہ ہے جس کی طرف لوگ کسی بلا یا مصیبت کے نازل ہونے پر مدد کے لیے رجوع کریں"۔

اُن کا ایک اور قول: "وہ سردار جو اپنی سیادت میں، اپنے شرف میں، اپنی عظمت میں، اپنے حلم اور بُردباری میں، اپنے علم میں اور اپنی حکمت میں کامل ہو"۔

——— حضرت ابوہریرہؓ: "وہ جو سب سے بے نیاز ہو اور سب اُس کے محتاج ہوں"۔

——— عِکرِمہ کے دوسرے اقوال: "وہ جس میں سے نہ کوئی چیز کبھی نکلی ہو نہ نکلتی ہو"۔ "جو نہ کھاتا ہو نہ پیتا ہو"۔ اِسی کے ہم معنی اقوال شعبی اور محمد بن کعب القُرظی سے بھی منقول ہیں۔

— سُدِّی: "مطلوب چیزیں حاصل کرنے کے لیے لوگ جس کا قصد کریں اور مصائب میں مدد کے لیے جس کی طرف رجوع کریں"۔

— سعید بن جُبَیر: "وہ جو اپنی تمام صفات اور اعمال میں کامل ہو"۔

— ربیع بن انس: "وہ جس پر کوئی آفت نہ آتی ہو"۔

— مُقاتِل بن حَیّان: "وہ جو بے عیب ہو"۔

— ابن کَیسان: "وہ جس کی صفت سے کوئی دوسرا مُتَّصِف نہ ہو"۔

— حَسن بصری اور قَتادہ: "جو باقی رہنے والا اور لازوال ہو"۔ اِسی سے ملتے جلتے اقوال مجاہد اور مَعمَر اور مُرَّۃُ الھَمدانی سے بھی منقول ہیں۔

— مُرَّۃُ الھَمدانی کا ایک اور قول یہ ہے کہ "وہ جو اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے فیصلہ کرے اور جو کام چاہے کرے، اس کے حکم اور فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے والا کوئی نہ ہو"۔

— ابراہیم نَخعی: "وہ جس کی طرف لوگ اپنی حاجتوں میں رجوع کریں"۔

— ابوبکر الانباری: "اہلِ لغت کے درمیان اِس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ صَمَد اُس سردار کو کہتے ہیں جس سے بالاتر کوئی اور سردار نہ ہو، اور جس کی طرف لوگ اپنی حاجات اور اپنے معاملات میں رجوع کریں"۔ اسی کے قریب اَلزَّجّاج کا قول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "صَمَد وہ ہے جس پر سرداری ختم ہو گئی ہو اور ہر ایک اپنی حاجات کے لیے جس کی طرف رجوع کرے"۔

اب غور کیجیے کہ پہلے فقرے میں اَللّٰہُ اَحَدٌ کیوں کہا گیا، اور اِس فقرے میں اَللّٰہُ الصَّمَدُ کہنے کی کیا وجہ ہے۔ لفظ اَحَد کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، کسی اور کے لیے سرے سے مستعمل ہی نہیں ہے، اس لیے اُسے اَحَدٌ، یعنی نکرہ کی صورت میں استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن صَمَد کا لفظ چونکہ مخلوقات کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اِس لیے اَللّٰہُ صَمَدٌ کہنے کے بجائے اَللّٰہُ الصَّمَدُ کہا گیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ اصلی اور حقیقی صَمَد اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ مخلوق اگر کسی حیثیت سے صَمَد ہو بھی تو کسی دوسری حیثیت سے وہ صَمَد نہیں ہے، کیونکہ وہ فانی ہے، لازوال نہیں ہے، قابلِ تجزیہ و تقسیم ہے، مرکّب ہے، کسی وقت اُس کے اجزا بکھر سکتے ہیں، بعض مخلوقات اُس کی محتاج ہیں تو بعض کا وہ خود محتاج ہے، اُس کی سیادت اضافی ہے نہ کہ مطلق، کسی کے مقابلے میں وہ برتر ہے تو اس کے مقابلے میں کوئی اور برتر ہے، بعض مخلوقات کی بعض حاجات کو وہ پورا کر سکتا ہے مگر سب کی تمام حاجات کو پورا کرنا کسی مخلوق کے

بس میں نہیں ہے۔ بخلاف اس کے اللہ تعالیٰ کی صمدیت ہر حیثیت سے کامل ہے۔ ساری دنیا اُس کی محتاج ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔ دنیا کی ہر چیز اپنے وجود و بقا اور اپنی حاجات و ضروریات کے لیے شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر اُسی کی طرف رجوع کرتی ہے اور سب کی تمام حاجات پُوری کرنے والا وہی ہے۔ وہ غیر فانی اور لازوال ہے۔ رزق دیتا ہے، لیتا نہیں ہے۔ مُفرد ہے، مرکب نہیں ہے کہ قابلِ تجزیہ و تقسیم ہو۔ ساری کائنات پر اس کی سیادت قائم ہے اور وہ سب سے برتر ہے۔ اس لیے وہ صمد نہیں بلکہ الصّمد ہے، یعنی ایک ہی ایسی ہستی جو حقیقت میں صمدیت سے تمام و کمال مُتَّصِف ہے۔

پھر چونکہ وہ الصّمد ہے اس لیے لازم آتا ہے کہ وہ یکتا اور یگانہ ہو، کیونکہ ایسی ہستی ایک ہی ہو سکتی ہے جو کسی کی حاجتمند نہ ہو اور سب جس کے محتاج ہوں، دو یا زائد ہستیاں سب سے بے نیاز اور سب کی حاجت روا نہیں ہو سکتیں نیز اُس کے الصّمد ہونے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہی ایک معبود ہو، کیونکہ انسان عبادت اُسی کی کرتا ہے جس کا وہ محتاج ہو اور اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہ ہو، کیونکہ جو حاجت روائی کی طاقت اور اختیارات ہی نہ رکھتا ہو اُس کی بندگی و عبادت کوئی ہوشمند آدمی نہیں کر سکتا۔

۵؎ مشرکین نے ہر زمانے میں خُدائی کا یہ تصوّر اختیار کیا ہے کہ انسانوں کی طرح خداؤں کی بھی کوئی جنس ہے جس کے بہت سے افراد ہیں، اور اُن میں شادی بیاہ اور توالد و تناسُل کا سلسلہ چلتا ہے۔ اِس جاہلانہ تصوّر سے انہوں نے اللہ رب العالمین کو بھی پاک اور بالاتر نہیں سمجھا اور اُس کے لیے بھی اولاد تجویز کی۔ چنانچہ اہلِ عرب کا یہ عقیدہ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ انبیاء علیہم السلام کی اُمتیں بھی اِس جہالت سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ اُن کے ہاں بھی کسی بزرگ انسان کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دینے کا عقیدہ پیدا ہو گیا۔ اِن مختلف توہّمات میں دو قسم کے تصوّرات ہمیشہ خلط ملط ہوتے رہے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ جن کو وہ اللہ تعالیٰ کی اولاد قرار دے رہے ہیں وہ اُس ذاتِ پاک کی نَسبی اولاد ہے۔ اور بعض نے یہ دعویٰ کیا کہ جس کو وہ اللہ کا بیٹا کہہ رہے ہیں اُسے اللہ نے اپنا مُتبنّیٰ بنایا ہے۔ اگرچہ اُن میں سے کسی کی یہ جراُت نہیں ہوئی کہ معاذ اللہ کسی کو اللہ کا باپ قرار دیں؛ لیکن ظاہر ہے کہ جب کسی ہستی کے متعلق یہ تصوّر کیا جائے کہ وہ توالد و تناسُل سے پاک نہیں ہے، اور اُس کے بارے میں یہ خیال کیا جائے کہ وہ بھی انسان کی طرح اُس قسم کی کوئی ہستی ہے جس کے ہاں اولاد پیدا ہوتی ہے، اور جس کو لاولد ہونے کی صورت میں کسی کو بیٹا بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے، تو پھر انسانی ذہن اِس گمان سے محفوظ نہیں رہ سکتا کہ اُسے بھی کسی کی اولاد سمجھے یہی وجہ ہے کہ جو سوالات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پُوچھے گئے تھے اُن میں ایک

سوال یہ تھا کہ اللہ کا نسب کیا ہے؟ اور دوسرا یہ کہ کس سے اُس نے دُنیا کی میراث پائی ہے اور کون اُس کے بعد وارث ہوگا؟

اِن جاہلانہ مفروضات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ منطقی طور پر اِن کو فرض کر لینے سے کچھ اور چیزوں کو بھی فرض کرنا لازم آتا ہے:

اوّل یہ کہ خدا ایک نہ ہو، بلکہ خداؤں کی کوئی جنس ہو، اور اس کے افرادِ خدائی کے اوصاف، افعال اور اختیارات میں شریک ہوں۔ یہ بات خدا کی صرف نَسبی اولاد فرض کر لینے ہی سے لازم نہیں آتی، بلکہ کسی کو متبنّٰی فرض کرنے سے بھی لازم آتی ہے، کیونکہ کسی کا متبنّٰی لامحالہ اُس کا ہم جنس ہی ہو سکتا ہے، اور جب معاذ اللہ وہ خدا کا ہم جنس ہے تو اِس سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خدائی کے اوصاف بھی رکھتا ہے۔

دوم یہ کہ اولاد کا کوئی تصور اِس کے بغیر نہیں کیا جا سکتا کہ نر و مادہ میں اِتّصال ہو اور کوئی مادّہ باپ اور ماں کے جسم سے نکل کر بچے کی شکل اختیار کرے۔ پس اللہ کے لیے اولاد فرض کرنے سے لازم آتا ہے کہ معاذ اللہ وہ ایک مادّی اور جسمانی وجود ہو، اُس کی ہم جنس کوئی اُس کی بیوی بھی ہو، اور اُس کے جسم سے کوئی مادّہ بھی خارج ہو۔

سوم یہ کہ توالد و تناسل کا سلسلہ جہاں بھی ہے اُس کی علت یہ ہے کہ افراد فانی ہوتے ہیں اور ان کی جنس کے باقی رہنے کے لیے ناگزیر ہوتا ہے کہ اُن سے اولاد پیدا ہو جس سے اُن کی نسل آگے چلے۔ پس اللہ کے لیے اولاد فرض کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہ بذاتِ خود معاذ اللہ فانی ہو اور باقی رہنے والی چیز خداؤں کی نسل ہو نہ کہ ذاتِ خدا۔ نیز اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ تمام فانی افراد کی طرح نعوذ باللہ خدا کی بھی کوئی ابتدا اور انتہا ہو۔ کیونکہ توالد و تناسل پر جن اجناس کے بقا کا انحصار ہوتا ہے اُن کے افراد نہ اَزلی ہوتے ہیں نہ اَبدی۔

چہارم یہ کہ کسی کو متبنّٰی بنانے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ایک لاولد شخص اپنی زندگی میں کسی مددگار کا، اور اپنی وفات کے بعد کسی وارث کا حاجت مند ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے لیے یہ فرض کرنا کہ اُس نے کسی کو بیٹا بنایا ہے، اُس ذاتِ پاک کی طرف لازماً وہی سب کمزوریاں منسوب کرتا ہے جو فانی اشخاص میں پائی جاتی ہیں۔

اِن تمام مفروضات کی جڑ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو اَحد اور اَلصَّمد کہنے سے ہی کٹ جاتی ہے، لیکن اُس کے بعد یہ ارشاد فرمانے سے کہ "نہ اُس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد"، اِس معاملہ میں کسی اشتباہ کی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی۔ پھر چونکہ ذاتِ باری کے حق میں یہ تصورات شرک کے اہم ترین اسباب میں سے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صرف سُورۂ اخلاص ہی میں اُن کی صاف صاف اور قطعی و حتمی تردید کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ جگہ جگہ اِس مضمون

کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے تاکہ لوگ حقیقت کو پوری طرح سمجھ لیں۔ مثال کے طور پر آیاتِ ذیل ملاحظہ ہوں:

إِنَّمَا اللَّهُ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ سُبْحَانَهُ أَن يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ ۘ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (النساء۔ ۱۷۱)

اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔ وہ پاک ہے اِس سے کہ کوئی اُس کا بیٹا ہو۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب اُس کی مِلک ہے۔

أَلَا إِنَّهُم مِّنْ إِفْكِهِمْ لَيَقُولُونَ وَلَدَ اللَّهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ (الصّٰفّٰت، ۱۵۱-۱۵۲)

خوب سُن رکھو، یہ لوگ دراصل اپنی من گھڑت سے یہ بات کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے۔ فی الواقع یہ قطعی جھوٹے ہیں۔

وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۚ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ إِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ (الصّٰفّٰت، ۱۵۸)

انہوں نے اللہ اور فرشتوں کے درمیان نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے، حالانکہ فرشتے خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ (مجرموں کی حیثیت سے) پیش کیے جانے والے ہیں۔

وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا ۚ إِنَّ الْإِنسَانَ لَكَفُورٌ مُّبِينٌ (الزخرف، ۱۵)

لوگوں نے اُس کے بندوں میں سے بعض کو اُس کا جزء بنا ڈالا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کھلا احسان فراموش ہے۔

وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ ۖ وَخَرَقُوا لَهُ بَنِينَ وَبَنَاتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يَصِفُونَ ۔ بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُن لَّهُ صَاحِبَةٌ ۖ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۔ (الانعام ۱۰۰-۱۰۱)

اور لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھیرا دیا، حالانکہ وہ اُن کا خالق ہے۔ اور اُنہوں نے بے جانے بوجھے اُس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیں، حالانکہ وہ پاک اور بالاتر ہے اُن باتوں سے جو وہ کہتے ہیں۔ وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اُس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ کوئی اُس کی شریک زندگی ہی نہیں ہے۔ اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا ۗ سُبْحَانَهُ ۚ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ (الانبیاء۔ ۲۶)

اور اِن لوگوں نے کہا کہ خدائے رحمٰن نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ پاک ہے وہ، بلکہ (جن کو یہ اس کی اولاد کہتے ہیں، وہ تو) بندے ہیں جنہیں عزت دی گئی ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ۗ سُبْحَانَهُ ۖ هُوَ الْغَنِيُّ ۖ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ إِنْ عِندَكُم مِّن سُلْطَانٍ بِهَٰذَا ۚ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا

لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ سبحان اللہ! وہ تو بے نیاز ہے۔ آسمانوں میں جو کچھ ہے اور زمین میں جو کچھ ہے سب اُس کی مِلک ہے۔ تمہارے پاس اِس قول کی آخر

تَعْلَمُوْنَ۔ (یونس۔ ۶۸)

دلیل کیا ہے؟ کیا تم اللہ کے بارے میں وہ باتیں کہتے ہو جنہیں تم نہیں جانتے؟

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ (بنی اسرائیل۔ ۱۱۱)

اور (اے نبی) کہو، تعریف ہے اُس خدا کے لیے جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا، نہ کوئی بادشاہی میں اس کا شریک ہے، اور نہ وہ عاجز ہے کہ کوئی اس کا پشتیبان ہو۔

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ (المؤمنون۔ ۹۱)

اللہ نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے، اور کوئی دوسرا خدا اس کے ساتھ نہیں ہے۔

اِن آیات میں ہر پہلو سے اُن لوگوں کے عقیدے کی تردید کر دی گئی ہے جو اللہ کے لیے نسبی اولاد یا متبنّٰی بنائی ہوئی اولاد تجویز کرتے ہیں، اور اُس کے غلط ہونے کے دلائل بھی بیان کر دیے گئے ہیں۔ یہ اور اِسی مضمون کی دوسری بہت سی آیات جو قرآن مجید میں ہیں، سورۂ اخلاص کی بہترین تفسیر کرتی ہیں۔

۷؎ اصل میں لفظ کُفُوًا استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں نظیر، مشابہ، مُماثل، ہم رُتبہ، مُساوی۔ نکاح کے معاملہ میں کُفو کا لفظ ہماری زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اِس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ لڑکا اور لڑکی معاشرتی حیثیت سے برابر کی جوڑ ہوں۔ پس اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات میں کوئی نہیں ہے، نہ کبھی تھا، نہ کبھی ہو سکتا ہے، جو اللہ کے مانند، یا اُس کا ہم مرتبہ ہو، یا جو اپنی صفات، افعال اور اختیارات میں اُس سے کسی درجہ میں بھی مشابہت رکھتا ہو۔

دعوتِ اسلامی اور کامیابی کا تصوّر

جناب اسعد گیلانی صاحب

(۲)

حقیقی کامیاب لوگوں کے اوصاف | اس کے بعد دعوتِ اسلامی کے علم بردار اور فائز المرام لوگوں کے کام اور ان کے اوصاف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

— ایمان لاتے جیسے کہ ایمان لانے کا حق ہے۔

— حق کے لیے گھر بار چھوڑ کر راہِ خدا میں ہجرت اختیار کر لی۔

— اللہ کی راہ میں مال صرف کیا۔

— اللہ کی راہ میں جان لڑا دی۔

کامیابی کے ساحل تک پہنچنے والی تحریکِ اسلامی کے فائز المرام کارکنوں سے اللہ کا دین یہ تقاضے کرتا ہے خود اللہ تعالیٰ بھی ان سے یہی کہتا ہے کہ تم نے تو یہ جانیں اپنے اللہ کے ہاتھ بیچ رکھی ہیں، اب اللہ کے راستے میں کھپانے کے بجائے انہیں چھپا چھپا کر کہاں لیے پھرتے ہو؟ اب اِن جانوں کو اور اپنے کماتے ہوئے مال و دولت اور سر و سامان کو اللہ کی راہ میں لگا کر سُرخرو ہو جاؤ۔ صرف اسی صورت میں تم اللہ کے نزدیک اسلامی تحریک کے معیاری کارکن بن سکتے ہو۔ اور اگر یہ صفات اپنے اندر پیدا نہ کرو تو پھر تحریک کے رجسٹر میں چاہے کتنا ہی اونچا اپنا نام لکھوا لو، اللہ کے ہاں فائز المرام اور کامیاب لوگوں میں وہ نام درج نہ ہوگا۔

اسی مطلوبہ معیار کی روشنی میں ہم تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کی سیرتوں اور ان کے کام کو ہر دَور میں دیکھیں گے اور اس معیار سے مطابقت یا عدمِ مطابقت سے ہی ان کی کامیابی کا معیار اور درجہ متعین کریں گے۔ وہ تحریک چاہے چودہ سو سال پہلے اُٹھے، یا چودہ سو سال بعد نمودار ہو، وہ بہر حال ہر دور اور ہر حال میں اخلاص، ایمان اور ایثار و قربانی کے اسی معیار پر پرکھی جائے گی۔ سب سے پہلے انفرادی طور پر ایک ایک کارکن کی اور اجتماعی طور پر پُوری تحریک کی پرکھ اور جانچ کی جائے گی۔ پھر اس کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا جا سکے گا کہ اس تحریک کی کامیابی کے امکانات کتنے

اور کس قدر ہیں۔

جہاں تک کسی دعوت کے داعیِ اوّل کا تعلق ہے بالعموم وہ ان صفات کو ایک حد تک پورا کرنے کے بعد ہی اہلِ نظر کی توجہ کا مرکز بنتا ہے لیکن جہاں تک اِس تحریک سے متاثر ہوتے اور اس سے وابستہ ہونے والے افراد کا تعلق ہے وہ تاثّر و قبولیت اور عمل و ایثار کے مختلف مقامات پر فائز ہوتے ہیں اور ان کی ٹیم کی صلاحیت پر ہی نظام کی تبدیلی کے لیے انقلابی اقدام کا دار و مدار ہوتا ہے۔ داعی اور رفقاءِ کار کی مثال کپتان اور اس کی ٹیم کی سی ہے ٹیم میسّر نہ آئے تو تنہا کپتان کی ساری عمدہ صلاحیتیں بھی میدانِ عمل میں کوئی نتیجہ نہیں دکھا سکتیں۔ ٹیم میسّر آئے لیکن ناکافی ہو تو بھی کام نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ ٹیم کافی ہو لیکن معیاری نہ ہو تو بھی مدّتِ انقلاب میں طوالت اور نوعیّتِ انقلاب میں تغیّر واقع ہو جاتا ہے۔ ٹیم معیاری اور کافی ہو تو نتیجہ لازماً کامیابی کی صورت میں نکلتا ہے۔ لیکن اگر ٹیم ناکافی بھی ہو اور غیر معیاری بھی تو کامیابی کے امکانات اور بھی بعید تر ہو جاتے ہیں۔ قرآن کی تاریخ میں وہی انبیاء اسلامی انقلاب لائے جنہیں مثالی پیروؤں کی قابلِ لحاظ تعداد مل گئی۔ جن انبیاء کو رفقاءِ کار کی قابلِ قدر قابلِ لحاظ ٹیم میسّر نہ آئی وہ اپنی جلالتِ شان اور ہدایت و قربتِ الٰہی کے باوجود اس عالمِ آب و گل اور دار الاسباب میں اسلامی انقلاب نہ لا سکے۔ یہی سنتِ الٰہی ہے اس فطری سُنّت سے انحراف کم ہی ہوتا ہے۔

غیر معیاری معاشرہ، غیر معیاری ٹیم | دعوتِ اسلامی کے لیے ناکافی اور غیر معیاری ٹیم ہمارے موجودہ معاشرے کی حقیقی بیماری ہے۔ جہاں تک اسلامی تحریک کے لیے میسّر آنے والے کارکن کے معیار کا تعلق ہے وہ معاشرے میں باقی ماندہ بنیادی انسانی صفات اور اسلامی صفات دونوں کے تناسب سے ہی ہو سکتا ہے۔ ہمارا موجودہ معاشرہ صدیوں تک غیر اسلامی نظام میں رہنے کو گوارا کرنے کے نتیجے میں عملی نفاق کا شکار ہے اور نفاق وہ بیماری ہے جو قوموں کو گھن کی طرح کھا جاتی ہے اور معاشرے میں سے اسلامی خصائل کے ساتھ ساتھ بنیادی انسانی صفات بھی رخصت ہو جاتی ہیں۔ ہمارے معاشرے کی عظیم اکثریت اسلام سے مکمل بے خبری اور بے عملی کے نتیجے میں اسلامی صفات سے محروم ہو چکی ہے۔ جہاں تک بنیادی انسانی صفات کا تعلق ہے وہ بھی اسلام کے ساتھ منافقانہ رویے کے سبب سخت مجروح ہو چکی ہیں اور بحیثیت ایک اجتماعی گروہ کے ہم بتدریج ان سے بھی محروم ہوتے چلے گئے ہیں۔ بہت سی انسانی صفات ایمان ہی کے مختلف مظاہر ہوتی ہیں اور عملِ صالح کے ساتھ مل کر ان صفات کو بہت تقویت پہنچتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی انقلابی دعوت کے لیے بنیادی طور پر ایسے ہی افرادِ معاشرہ کام دے سکتے ہیں جن میں وہ ایمان پرور مردانہ خوبیاں موجود ہوں جو کسی انقلابی جدوجہد، کسی جاں گسل کشمکش، اور کسی جاں توڑ کھکھیڑ کے مصائب برداشت

کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ جس طرح مٹی اور لکڑی سے تلوار نہیں بن سکتی اسی طرح منافقت، مفاد پرستی بزدلی اور دوغلے پن کے شکار افراد انقلابی کارکن نہیں بن سکتے اور نہ وہ کسی نظام کے خلاف کشمکش کرنے اور اس کشمکش کے لیے سارے جان لیوا مراحل سے گزرنے کا حوصلہ ہی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ حق کو حق جان کر اور مان کر بھی اس کی پشت پناہی سے گریز کر جایا کرتے ہیں اور باطل کو باطل جان کر بھی اس کی تردید سے پہلو تہی کیا کرتے ہیں۔

کامیابی کے لیے کارکن کی انسانی صفات کسی نظام کو بدل دینے والی عظیم کشمکش کے لیے ایک فرد میں جن بنیادی انسانی صفات کی کم سے کم ضرورت ہوتی ہے وہ ارادے کی طاقت اور فیصلے کی قوت ہے۔ عزم اور حوصلہ ہے۔ صبر و ثبات اور استقلال و پامردی ہے۔ تحمل اور برداشت ہے۔ ہمت اور شجاعت ہے۔ مستعدی اور جفاکشی ہے۔ اپنے مقصد کا عشق اور اس کے لیے قربانی دینے کا جذبہ حوصلہ اور بل بوتا ہے۔ احتیاط، معاملہ فہمی اور تدبّر ہے۔ باضابطگی سے کام کرنے کا سلیقہ، فرض شناسی، احساس ذمہ داری، حالات کو سمجھنے اور ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے اور مناسب تدابیر اختیار کرنے کی قابلیت ہے۔ اپنے جذبات، خواہشات اور ہیجانات پر قابو اور کنٹرول ہے۔ دوسرے انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے، ان کے دل میں اپنی جگہ پیدا کرنے اور ان سے اپنا کام لینے کی صلاحیت ہے۔ ان خوبیوں کے علاوہ اس میں چند وہ شریفانہ صفات بھی ضروری ہیں جن سے انسان عمدہ انسان بنتا اور کہلاتا ہے، یعنی خودداری، فیاضی، رحم، ہمدردی، انصاف، وسعتِ قلب و نظر، صداقت، امانت، راست بازی، پاسِ عہد، معقولیت پسندی، اعتدال، شائستگی، صفائی اور دل و دماغ کی نفاست۔ ظاہر ہے کہ ان ہی کم و بیش خوبیوں سے ایک فسیدار انسان وجود میں آتا ہے اور ایسا ہی انسان کسی مقصدِ حیات کو اپنائے تو اس کے لیے فولاد کی تلوار کے مانند کام کرتا ہے۔ اعترافِ حق تو ظاہر ہے کہ کوئی انقلابی عمل نہیں ہے۔ البتہ اعتراف کے بعد رفاقتِ حق، علمبرداریٔ حق، پاسداریٔ حق، اور حمیت و غیرتِ حق کا ہونا اشد ضروری ہے۔ اِس لیے کہ ان کے بغیر انسان حق کے لیے گردن نہیں کٹا سکتا۔ انسان کے اندر یہ صفات ہوں تو اسے قوت کا سرچشمہ بنا دیتی ہیں۔ پھر وہ اپنا وزن جس تحریک کے پلڑے میں ڈالتا ہے وہ پلڑا اس کے وزن کو محسوس کرتا ہے۔ اور اگر کسی فرد میں یہی بنیادی صفات نہ ہوں تو اس کا اعترافِ حق ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کوئی خشک پتہ ہوا کے جھونکے کی آمد کا اعتراف کرتا ہے اور اس کے ساتھ اڑنے لگتا ہے۔ لیکن وہ کسی کے لیے بھی خطرہ یا آسرا نہیں ہوتا۔ جیسے تنکا سیلاب کی حقیقت کا اعتراف کرتا ہے اور اسی کے رخ پر بہنے لگتا ہے لیکن اس کی موجودگی سے کسی مٹی کے ڈھیلے کو بھی خطرہ نہیں ہوتا اور نہ اس سے کوئی بند باندھا جا سکتا ہے۔

کامیابی کے لیے کارکن کی اسلامی صفات ایسی خوبیوں والے انسانوں کی مدد سے کوئی بھی عظیم انقلابی تحریک اٹھائی جا

سکتی ہے اور ایسے لوگ اس تحریک کے لیے بیش بہا سرمایہ اور اثاثہ بن سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ تحریک، ایک اسلامی تحریک ہو تو پھر وہ اپنے کارکنوں کی ان صفات میں مزید وسعت، بلندی اور پائیداری پیدا کر کے ان سے کام لیتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی بہت سی خرابیوں کو دُور بھی کر دیتی ہے۔ وہ اپنے مطلوبہ کارکنوں میں سے خود غرضی، نفسانیت، کبر و غرور، ظلم و تشدد، بے حیائی، نفس پرستی اور بے قید استعمالِ قوت کو دُور کر کے ان میں خدا ترسی، تقویٰ، پرہیزگاری، حق پرستی، ضبطِ نفس، فیاضی، رحمدلی، ہمدردی، امانت، بے غرضی، انسانی خیر خواہی، بے لوث انصاف پسندی، صداقت و راست بازی کی بلند صفات پیدا کر دیتی ہے۔ اس طرح کارکن کی سیرت کے سونے پر سہاگہ کر کے وہ اسے میدانِ عمل میں اُتارتی ہے تو تحریک کی تھوڑی سی مادی قوت بھی اپنے سے دس گنا باطل قوت سے ٹکرا کر اسے مغلوب کر لیتی ہے۔ تاریخِ انسانی ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ اور حضورؐ اکرم کی اسلامی تحریک اس پر سب سے بڑی پُرعظمت گواہی دیتی ہے۔

اسلامی تحریک میں عذر و معذرت اور رخصت کا مقام | تحریکِ اسلامی کا کام دین کی اقامت کا کام ہے۔ اور یہ کام مومن کے لیے فریضہ ہے۔ اس میں رخصت کا مقام مومن کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اس کے باوجود وابستگی اور تربیت کے لحاظ سے بھی تحریک کے اندر مختلف لوگ مختلف مدارج پر ہوتے ہیں۔ تاثر، ذہنی اتفاق اور ہمدردی تو مکمل انکشافِ حق کی منزل سے نیچے کی منزلیں ہیں۔ البتہ جب آدمی پورے حق کو بے نقاب دیکھ لے اور اس کی حقیقت اس کے قلب و نظر میں سورج کی طرح روشن ہو کر اُتر جاتے تب وہ کسی انقلابی اور دعوتی تحریک کی اس بنیادی رکنیت تک پہنچتا ہے جب وہ تحریکی عمارت کے ستونوں میں سے ایک ستون بن جاتا ہے۔ یہ مقامِ عزیمت ہے۔ رخصت و عذرات کے مقامات سب تاثر، اتفاق و ہمدردی کے ابتدائی درجوں میں رہ جاتے ہیں۔ جو شخص علی الاعلان اس سوال کا جواب مردانہ وار اثبات میں دے چکا ہے وہ مقامِ رخصت سے بہت آگے کی منزل پر جا پہنچتا ہے۔

"کیا آپ نے اس راہ میں پیش آنے والی رکاوٹوں اور مشکلات کا خوب اچھی طرح سے اندازہ کر لیا ہے؟ اور یہ جان لیا ہے کہ تحریک میں آکر آپ کو کیا اختیار کرنا ہے اور کیا چھوڑنا پڑے گا؟ کیونکہ اس جماعت میں شامل ہو کر آپ کو اپنی پوری زندگی اور اس کے سارے مسائل اور معاملات (انفرادی، اجتماعی، خاندانی، تمدنی، معاشرتی، معاشی، اور سیاسی) کو غیر مشروط طور پر اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت اور نظامِ جماعت کی پابندی میں دے دینا ہے اور پھر نہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے گھبرانا ہے اور نہ اس کی پروا کرنا ہے کہ کون آپ کے ساتھ آتا ہے اور کون کٹ جاتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ اس چیلنج کو قبول کر کے جو شخص اپنے پورے شعور اور ہوش و حواس کے ساتھ سنجیدگی سے آگے بڑھتا ہے وہ بدر کے مجاہدوں کی مانند گھر بار چھوڑنے، کاروبار سے محروم ہونے، ملازمتیں ترک کرنے، دیس سے پردیس کی طرف ہجرت کر جانے اور پھر جان کو ہتھیلی پر رکھ کر مقتل میں آنے تک کا داعیہ اور عزم لے کر آگے بڑھتا ہے۔ خاندانی رشتے، معاشی بندھن، اجتماعی تعلقات کوئی شے بھی اس کے پاؤں کی بیڑی اور اس کے ہاتھ کی ہتھکڑی نہیں بن سکتی۔ ایسے لوگوں کے لیے اجتماعات میں شرکت اور تحریک کے روزمرہ کے کام انجام دینا تو گویا جنگ سے پہلے سپاہی کی تربیتی پریڈ ہے۔ جو سپاہی اس معمولی تربیتی پریڈ میں بھی شرکت سے معذور ہو کر رہ جاتا ہے اور جسے معمولی سے معمولی عذرات روک کر بٹھا لیتے ہیں، اُس سے جدوجہد کے دوران پیش آنے والے بڑے معرکوں میں کوئی کارنامہ دکھانے یا غیرتِ حق کے لیے کٹ مرنے کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں جو اسلام میں جہاد کا حکم رکھتی ہے، کامیابی کی سب سے بڑی دشمن بزدلی اور بدنظمی ہے۔ اس کام میں معقول عذر کے بغیر پیچھے رہ جانے والے ایسے ہی لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے دورِ حاضر کی اسلامی تحریک کے داعی نے فرمایا:

"بہت سے ارکان کسی عذرِ معقول کے بغیر نہیں آتے۔ لوگوں کے لیے ان کے معمولی کام، ان کے روزمرہ کے مشاغل ان کے خانگی امور، ان کے دنیوی مفاد اس سے بڑھ کر اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ جماعت کی پکار پر لبیک کہیں۔ اِسی بنا پر وہ غیر اولی الضرر ہونے کے باوجود بیٹھے رہ گئے۔ اگر وہ جانتے کہ جو عہد انہوں نے اب اپنے رب سے کیا ہے اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں تو وہ بڑے سے بڑے دنیوی فائدے اور سخت سے سخت مشغولیت کو بھی یہاں کی حاضری پر ہرگز ترجیح نہ دیتے۔ نظامِ جماعت سے وابستہ ہونے کے بعد آدمی کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ جماعت کی پکار سن کر دوڑ پڑے اور سارے کام چھوڑ دے۔ خدا اور رسولؐ کی دی ہوئی رخصت کے علاوہ باقی تمام حالات میں جماعت کی شرکت کے لیے دوسری ہر مشغولیت سے قطع نظر کر لینا لازم ہے۔ ہمیں صرف ان لوگوں کی ضرورت ہے جنہیں فی الواقع کچھ کرنا ہو اور جو کسی خارجی دباؤ سے نہیں بلکہ ایمان کے اندرونی تقاضے سے خدا کے دین کو قائم کرنے کی سعی کرنا چاہتے ہوں۔" (رُوداد دوم ۱۲-۱۳)۔

درحقیقت اللہ کے دین کے لیے مومن کی جدوجہد کی نوعیت اور حقیقت اللہ کے ساتھ جنت کے بدلے جان و مال کا سودا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ کا مفہوم یہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی جماعت میں جو شخص بھی داخل ہونے کا ارادہ کرے اسے پہلے اچھی طرح جانچ پڑتال کر کے دیکھ لینا چاہیے کہ آیا فی الحقیقت اس کی یہی غرض اور یہی نوعیت ہے اور یہی کام اس کے پیشِ نظر ہے۔ ایک موقع پر

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے ساتھیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"ایسے معاہدۂ بیع کی یہ حیثیت نہیں ہوسکتی کہ ایک کوٹ ہے جسے جب چاہا پہنا اور جب چاہا اتار دیا۔ اِدھر قدم بڑھانے سے پہلے اپنی واپسی کی کشتیاں جلا دیجیے۔ یہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھیے کہ اب پلٹ کر جانے کے لیے کوئی جگہ آپ کے لیے نہیں ہے۔ خدا سے عہد باندھنے کے بعد جس جان و مال کو آپ بیچ چکے اسے اب آپ واپس نہیں لے سکتے۔ اس معاہدہ کے ساتھ ہی آپ سر دھڑ کی بازی لگا چکے ہیں۔ اب آپ کو جان لڑا کر یہ کام کرنا ہے۔ خود اس راہ پر چلنا ہے۔ دوسروں کو چلانا ہے۔ کوئی خرابی نظر آئے تو بھاگنے کی فکر نہ کیجیے۔ بلکہ کم از کم اُسی جذبے کے ساتھ اُسے دُور کرنے کی فکر کیجیے جس طرح آپ کے گھر میں آگ لگ جائے تو اُسے بجھانے کی کوشش کریں گے۔ آگے والا نہ چلے تو پیچھے سے سرک نہ جایئے بلکہ یا تو اسے چلنے پر مجبور کیجیے یا اسے ہٹا کر پھینک دیجیے اور خود آگے بڑھیے۔ یہاں آکر اگر آپ اس کام میں دلچسپی نہ لیں گے یا وقت، مال، محنت اور دل و دماغ اور جسم و جان کی قوتیں اس راہ میں صرف کرنے سے جی چرائیں گے یا دوسرے کاموں کو اس کام پر مقدم رکھیں گے تو اپنے خدا سے بے وفائی کریں گے۔ آپ کا عہد کسی انسان سے نہیں خدا سے ہے، تحریک میں شرکت کے وقت جو عہد آپ نے کیا ہے اس کے ساتھ ہی آپ اپنا سب کچھ اور خود اپنے آپ کو خدا کے ہاتھ بیچ چکے ہیں۔ اب آپ کی ہر چیز پر پہلا اور مقدم حق خدا اور اس کے رسولؐ کا ہے، باقی تمام چیزیں اس سے مؤخر ہیں"۔

(رُوداد دوم۔ ۲۲-۲۳)

دوسرے موقع پر تحریکی کام کے مقابلے میں اپنے بے شمار حقیقی اور غیر حقیقی عُذرات پیش کرنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"عُذر کے لیے ہم نے عُذرِ شرعی کی قید لگائی ہے۔ اس کے لحاظ سے کاروبار کا حرج یا مالی نقصان کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر ہمارے رفقا اس وقت اتنی قربانی بھی نہیں کرسکتے تو آئندہ ان سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ ہمارے رفقاء میں آخر متعدد ایسے لوگ بھی تو ہیں جو ملازم تھے اور انہیں چھٹی نہ مل سکی تو وہ پھر بھی اجتماع میں شریک ہونے کے لیے آ گئے۔ اور اب وہ اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہمارے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتماد ہیں۔ جو ارکانِ جماعت محض کاروباری خطرے سے نہیں آتے ہیں ان سے صاف کہہ دینا چاہیے کہ اب اپنے کاروبار ہی کی خدمت کرتے رہیں اس

عظیم الشان نصب العین کی خدمت کا نام لینا آپ کے لیے کچھ موزوں نہیں ہے۔"

(رُوداد حصّہ سوئم صفحہ ۱۱۹ - ۱۲۰)

تحریکِ اسلامی کی رکنیت - مقامِ عزیمت | تحریکِ اسلامی کا کام عزیمت کا کام ہے۔ یہاں طلبِ رخصت مقامِ بلند سے گرنے کا نام ہے۔ جن لوگوں نے کبھی یہ راستہ اختیار کیا ہے وہ ہمیشہ اپنے دَور کے صاحبِ عزیمت لوگ رہے ہیں اور اُنہی نے اپنے دَور میں تاریخی کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔ داعیٔ تحریک نے فرمایا ہے:-

"جس دل میں مقصد کے عشق کی آگ مشتعل ہوچکی ہو وہاں کسی ٹھیلنے اور اکسانے والے کی ضرورت نہیں رہتی۔ مَیں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اگر آپ اس راہ میں کم از کم اُتنے قلبی لگاؤ کے بغیر قدم بڑھائیں گے جتنا آپ اپنے بیوی بچوں سے رکھتے ہیں تو انجام پسپائی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اور یہ ایسی پسپائی ہوگی کہ مدتوں تک ہماری نسلیں اس تحریک کا نام لینے کی جرأت بھی نہ کرسکیں گی۔ بڑے بڑے اقدامات کا نام لینے سے پہلے اپنی قوتِ قلب کا اور اپنی اخلاقی طاقت کا جائزہ لیجیے اور مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لیے جس دل گردے کی ضرورت ہے وہ اپنے اندر پیدا کیجیے۔" (رُوداد دوئم ۴۲ - ۴۳)

ظاہر ہے کہ تحریکِ اسلامی کا برپا ہونا کسی قوم کو آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ یہ تحریک عام سیاسی پارٹیوں اور مذہبی اور گروہی جماعتوں کی طرح شب و روز میں عام طور پر تو برپا نہیں ہوتی رہتی، بلکہ یہ تحریک صدیوں بعد کسی معاشرے کے اندر برپا ہوتی ہے اور اس کے برپا ہوتے ہی قوم اور اس کا فرد فرد آزمائش کے کٹہرے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کی ناکامی معمولی ناکامی نہیں ہے۔ درحقیقت اس کی ناکامی کسی قوم اور معاشرے کی اپنے حقِ زیست و فلاح سے محرومی اور خود اس کی اپنی ناکامی ہے۔ اس لیے جو لوگ اس سے وابستہ ہوں ان کی ذمہ داری بھی خدا و خلق کے سامنے نہایت اہم ذمہ داری ہے۔ وہ اسے محض کھیل تماشے یا تفریحِ طبع یا وقت گزاری اور شغل کے طور پر اختیار نہیں کرسکتے اس لیے کہ پوری انسانیت کی فلاح کا چارٹر اس تحریک کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اس کے لیے جدوجہد میں کمی یا خامی پوری انسانیت اور انسانیت کے خالق کے ساتھ بے وفائی ہے۔ اس لیے ایسی تحریک کے مقامِ رکنیت تک پہنچے ہوئے لوگ درحقیقت اس تحریک کے محسنین کا گروہ ہوتے ہیں جو تحریک کے لیے جان و مال قربان کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ اس گروہ کا فرد فرد اللہ رب العٰلمین کو گواہ کرکے اقرار کرتا ہے:

"مَیں اللہ رب العٰلمین کو گواہ کرکے اقرار کرتا ہوں کہ مَیں نے تحریک کے نصب العین کو اس کی تشریح کے ساتھ اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور یہ سمجھنے کے بعد اقرار کرتا ہوں کہ دنیا میں اللہ کے دین کو قائم کرنا میری

زندگی کا نصب العین ہے اور میں اِسی نصب العین کے حصول کی سعی کے لیے خالصتہً للہ تحریک میں شامل ہوا ہوں اور اِس کام میں میرے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ کی رضا اور فلاحِ اُخروی کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔" (حلف نامہ رکنیت)

اس قول و قرار کے بعد ایک فرد اسلامی تحریک کے انقلابی قافلے میں شریک ہو جاتا ہے اور اپنے تمام دیگر کام کاج، مصروفیات، تعلقات اور نفع و نقصان کو نظر انداز کر کے اسلام کو غالب کرنا اپنی زندگی کا مشن بنا کر آگے بڑھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی مثال اس شخص کی سی ہوتی ہے جو بہتے ہوتے دھارے کا رُخ موڑنے کا عزم کر کے آگے بڑھتا ہے۔ جو باطل کے سیلاب کے آگے بند باندھنے کا ارادہ کر کے اٹھتا ہے۔ جو ملک و قوم پر غالب مقتدر ترین لوگوں کا حریف بن کر سامنے آتا ہے۔ جو طاقت کے سرچشموں پر قابض قوت کو اپنا قبضۂ غاصبانہ چھوڑ دینے کا چیلنج بن کر آتا ہے۔ وہ شخص جس نے بہتے دریا کے مخالف سمت میں تیرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، جس نے غالب نظام کے ساتھ موافقت کے نتیجے میں حاصل ہونے والے تمام فوائد و اعزازات سے ہاتھ اُٹھا لیا ہے، جس نے بقول سیدنا عیسٰی علیہ السلام اپنی صلیب آپ اپنے کندھوں پر اٹھالی ہے جس نے اپنے آپ کو باطل کے ظالم بھیڑیوں کے سامنے ڈال دیا ہے، جو سر ہتھیلی پر رکھ کر مقتل میں آکھڑا ہوا ہے۔ جو گڑھے میں گاڑے جانے اور آروں سے چیرے جانے والے راستے پر چل کھڑا ہوا ہے۔ جو لوہے کی کنگھیوں سے گوشت نچوانے والوں کے قافلے میں شریک ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ راستہ سہل انگاری سے محض دل کی کسی ہلکی سی چاہت یا دماغ کی کسی رومانوی لہر کی رَو میں آکر اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو پوری زندگی کا سودا ہے اور زندگی کے سودے کرنے کے بعد لوگ نفع و نقصان کی ترازو تیں لے کر نہیں بیٹھا کرتے۔ مقصدی عشق کا یہ وہ صحرا ہے جس میں مجنوں حواس کھو بیٹھتا ہے اور یہ وہ ناقابلِ عبور پہاڑ ہے جسے دیکھ کر ہی فرہاد کا پِتّہ پانی ہوتا ہے ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

ارباب عزیمت کی مقصدی ضروریات | اسلام کو اگر کسی نے مقصدِ زندگی اور عمر بھر کا مشن بنایا ہو تو اسے اسلام کا صحیح فہم حاصل ہونا بھی مطلوب ہے۔ اس پر پختہ ایمان بھی درکار ہے۔ اس کے سانچے میں اپنی سیرت و کردار کو ڈھالنا بھی ضروری ہے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دین کے سوا پھر اس کی زندگی کا کوئی اور مقصد نہ بننے پاتے۔ اس مقصد کے لیے جو لوگ اُٹھیں ان میں باہمی اخوت و محبت بھی ناگزیر ہے تاکہ وہ بنیانِ مرصوص بن کر کام کر سکیں۔ ان کے کام بھی

باہمی مشاورت سے ہی سر انجام پانے چاہییں۔ ان کی زندگیاں نظم و ضبط کی پابند باضابطہ اور باقاعدہ ہونی چاہییں۔ ان میں باہمی احتساب و تنقید کا عمل بھی جاری ہونا چاہیے جو دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے نہیں بلکہ اصلاحِ احوال اور درستیِ اخلاق میں مدد دے۔ ان کا تعلق اللہ کے ساتھ مخلصانہ اور گہرا ہونا چاہیے۔ ان کے ہر کام کی بنیاد فکرِ آخرت پر ہونی چاہیے۔ ان کے حسنِ سیرت کی چمک سے پورے ماحول کو جگمگانا چاہیے۔ ان کی وسیع الظرفی، ان کی عالی حوصلگی، ان کی ہمدردی و خیر خواہی اور شرافت و کریم النفسی کو اپنے ماحول میں ضرب المثل ہونا چاہیے۔ مشکلات آپڑنے پر ان کا صبر و استقلال اور ثبات و استقامت مثالی ہونا چاہیے۔ ان کے جاننے والے سب لوگ جانتے ہوں کہ مشکل حالات میں ان کا طرزِ عمل بزدلی اور شکست خوردگی پر نہیں بلکہ عزیمت اور جرأت و بہادری پر مبنی ہوگا۔ ان کی تبلیغ اور جد و جہد حکمت و دانش مندی کے تمام اصولوں کے مطابق ہونی چاہیے اور ان کے اندر اپنے نصب العین کے لیے ایک راستہ بند ہونے پر دس دوسرے راستے نکال لینے کی سمجھ اور بصیرت ہونی چاہیے۔ انہیں کبر و غرور سے بچتے ہوئے اپنے اندر اعلیٰ درجے کا احساسِ بندگی پرورش کرنا چاہیے اور ہر وقت اپنا محاسبۂ نفس کرتے رہنا چاہیے۔ انہیں نمود و نمائش سے بچتے ہوئے ہر اپنا کام خالص اللہ سے اجر لینے کی نیت سے کرنا چاہیے اور اپنے درمیان اعلیٰ صفات کے افراد پر نظر رکھنی اور ان کی پیروی کرنی چاہیے۔ انہیں اپنے اعمال کو تباہ کرنے والی کھوٹی نیت سے بچنا چاہیے اور نفسانیت اور خود پسندی سے بچ کر اللہ کے سامنے توبہ و استغفار کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ انہیں ہر محفل و مجلس و مقام پر جہاں جہاں ممکن ہو کلمۂ حق کا اظہار بے دریغ اور بے جھجک کرنا چاہیے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی کوئی پروا نہ کرنی چاہیے۔ باہمی بغض و حسد اور بدگمانی، غیبت، چغل خوری، کھسر پھسر اور سرگوشیوں سے خود بھی بچ کر رہنا چاہیے اور ایسی کسی چیز کو اپنی جماعت کے اندر بھی داخل نہ ہونے دینا چاہیے اور بدقسمتی سے اگر وہ داخل ہو ہی جائے تو پھر اس کا پیچھا کر کے اسے پوری طرح ختم کر دینا چاہیے۔ مزاج کی شدت، اشتعال انگیزی، جذباتیت، انتہا پسندی، یک رخا پن، بے اعتدالی، تنگ دلی، غیر مستقل مزاجی اور ارادے کی کمزوری سے بچ کر انہیں پورے اعتدال اور استقامت کے ساتھ متواتر اور مسلسل عمر بھر کے لیے اپنے اندر دین کا کام کرتے رہنے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہیے۔

صفاتی قوت سے چھوٹے گروہ کا بڑے گروہ پر غلبہ ضروری صفات کا یہ وہ ناگزیر اور کم از کم سانچہ ہے جس میں اسلامی انقلابی تحریک کے کارکن کا ڈھلا ہوا ہونا نہایت ضروری ہے۔ جس کے بغیر حکومتِ الٰہیہ کے قیام، اسلامی نظام کے نفاذ، اعلائے کلمۃ الحق، غلبۂ اسلام، اقامتِ دین، خلافتِ راشدہ کے احیاء اور اسلام کے لیے تمکن فی الارض کا کام سر انجام نہیں دیا جا سکتا۔ حضور اکرمؐ نے جب ان صفات کا سانچہ عربوں کے جاہلی معاشرے میں نصب فرمایا تو

ان میں بنیادی انسانی صفات کے حامل لوگ بڑی تعداد میں موجود تھے۔ وہ جس رُخ پر زندگی بسر کر رہے تھے اس کے بارے میں ان کا طرزِ عمل مخلصانہ تھا۔ موافقت کی تو مخلصانہ کی۔ رفاقت کی تو دل و جان سے کی۔ مخالفت کی تو مخلصانہ کی اور مخالفت کے بعد موافق بنے تو جان نثار بن کر آئے اور راہِ حق میں اپنا سب کچھ لٹاتے ہوئے آئے۔ انسانی بنیادی صفات کا لوہا ان میں موجود تھا۔ اسلام کی آزمائشوں کی بھٹی نے تپا کر اسے فولاد بنایا اور پھر حق کی سان پر چڑھا کر انہیں اللہ کی برہنہ تلواریں بنا دیا۔ پھر وہ جس میدان میں گئے، بے سروسامان تھے تو سروسامان والوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ تعداد میں کم تھے تو بڑے بڑے لشکروں کو میدانِ جہاد سے پسپا کر دیا۔ اِس لیے کہ ان کے پاس اخلاقی صفات کا وزن جو تُلنے، گِننے اور ناپنے میں نہیں آتا اتنا زیادہ تھا کہ بالآخر تحریکِ اسلامی کے مجاہدوں کی عمومی صفت ہی یہ بن گئی:

كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ

ایسی اعلیٰ صفات کے افراد جب کسی داعی کی رفاقت میں جمع ہو جاتیں تو تدریج مخالفتوں کے جھاڑ جھنکار اور رکاوٹوں کے پہاڑ کائی کی طرح چھٹتے چلے جاتے ہیں اور قافلۂ حق کشاں کشاں منزلِ مقصود پر پہنچ کر ہی دم لیتا ہے پھر باطل کے ساتھ معرکہ آرائی کا لطفِ مدام، دعوتِ اسلامی کو اور بھی جوان و توانا اور قوت و شجاعت کا پہاڑ بنا دیتا ہے۔ جب قافلہ اور قافلہ سالار دونوں ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے، ایک ہی رفتار سے چلنے والے، ایک ہی لگن رکھنے والے، اور ایک ہی دُھن کے پکے ہوں تو حریفانِ کم ظرف کے لیے ان کا مقابلہ ممکن نہیں ہوتا۔ میدانِ کشمکش میں دشمن کے قدم انہی مجاہدوں کے سامنے سے اکھڑتے ہیں جو میدانِ جہاد میں موجود ہوں، لڑ رہے ہوں اور دشمن پر اپنے جان و مال و قوت و یکسوئی اور زورِ بازو سے دباؤ ڈال رہے ہوں۔ ورنہ جو عذرات کی آڑ میں بیٹھے آرام فرما رہے ہوں اور میدانِ جہاد گرم ہونے پر مختلف تاویلات کے مورچوں میں دبکے بیٹھے ہوں ان کے سامنے سے کون احمق دشمن ہوگا جو خوف زدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوگا۔

درحقیقت ہر تحریک کے لیے کامیابی اور ناکامی کا مسئلہ کپتان اور اس کی ٹیم، سالار اور اس کے قافلہ، جرنیل اور اس کے لشکر کے لیے مطلوبہ صفات اور متناسب تعداد کے مسئلے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ جدوجہد کے میدان میں کامیابی و کامرانی کے لیے اللہ کی سنت جن اصولوں کا لحاظ کرتی ہے ان میں تعداد (QUANTITY) اور نوعیت و کیفیت (QUALITY) کے اصول اپنی جگہ پر بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ تعدادِ کارکنان اگر تناسب سے بھی کم ہو اس صورت میں بھی تحریک کا انقلاب قیادت کی منزل تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور افراد

ہیں مطلوبہ خصوصیات و صفات کی کمی ہو تب بھی انقلاب دُور تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ مخصوص صفات والا انقلاب اِن دونوں چیزوں کا اہتمام چاہتا ہے اور جو لوگ کسی صالح انقلاب کے داعی اور کارکن بن کر آئیں ان کے لیے ضروری ہے کہ ان دونوں اُمور پر نگاہ رکھیں۔ اور اگر ان دونوں میں کہیں کوئی کمی پائی جاتی ہے تو مضطرب ہو کر رفقاء جماعت یا نظامِ جماعت یا حالاتِ زمانہ یا قیادتِ تحریک یا قوم یا طریقِ کار کو کوسنے کی بجائے اِن خامیوں اور کوتاہیوں کو دُور کرنے کی کوشش کریں۔ یہ خامیاں اگر مناسب حد تک دُور ہو جائیں تو جس طرح بارش برسنے سے ہر طرف پانی ہی پانی ہو جاتا ہے اسی طرح اعلیٰ مطلوبہ انقلابی صفات کی حامل متناسب تعداد کارکنان کی جماعت میدانِ عمل میں ایک روز بازی جیت کر رہتی ہے اور ایسے گونگے طوفانوں کا مقابلہ کرنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا شرط یہ ہے کہ اللہ پر توکّل رکھ کر صبر و حکمت و استقلال و جرأت کے ساتھ مسلسل اور متواتر جد و جہد جاری رکھی جائے۔ مسلسل تیرنے والے بالآخر سمندر بھی پار کر لیا کرتے ہیں۔ میرے نزدیک کامیابی کا بے خطا راستہ یہی ہے ؎

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

معذرت

ایک صاحب نے توجہ دلائی ہے کہ تفہیم القرآن جلد اوّل کے انڈکس میں صفحہ ۶۲۷، سطر ۱۶ کالم ۲ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے "نبی صلعم" کے الفاظ شائع ہو گئے ہیں۔ یہ ایک غلطی ہے جس کی اصلاح کر لینی چاہیے۔ میں ہمیشہ حضورؐ کے اسمِ گرامی کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم لکھتا ہوں اور صلعم لکھنے کو صحیح نہیں سمجھتا۔ دراصل یہ انڈکس میرا بنایا ہوا نہیں ہے بلکہ ایک رفیق کا بنایا ہوا ہے۔ میری نگاہ آج تک اس مقام پر نہیں پڑی ورنہ میں پہلے ہی اس کی اصلاح کر دیتا۔

ابوالاعلیٰ

ایمان اور محبت

عبد الحمید صدیقی

محبت، رضا سے معناً خاص تر اور اثرات کے اعتبار سے عمیق تر ہے۔ آدمی بسا اوقات کسی چیز یا شخص سے راضی ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ گہرا قلبی تعلق نہیں رکھتا۔ یہی قلبی تعلق رضا اور محبت کے فرق کو واضح کرنے والی چیز ہے۔ محبت روحِ موجودات، اکسیرِ قلوب اور رجانِ امن و سلامتی ہے۔ جس طرح قانونِ کشش کے تحت یہ کرۂ خاک دیگر سیارے اور افلاک اپنی اپنی جگہ پر قائم ہیں اسی طرح جذبۂ محبت تعلقاتِ انسانی کو خراب ہونے یا تصادم کی صورت اختیار کرنے سے بچاتا ہے۔ محبت کی قدر و قیمت انسان اچھی طرح سمجھتا ہے اور وہ جو کسی نے کہا ہے کہ اگر محبت منصبِ سیادت پر فائز ہو جائے تو دنیا کو نہ عدل کی ضرورت رہے نہ قانون کی۔ اس سے محبت کی قدر و قیمت کا صحیح اظہار ہوتا ہے۔ مولانا رومیؒ نے محبت کے اثرات کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے وہ فرماتے ہیں "محبت تلخ کو شیریں، مٹی کو سونا، کدورت کو صفا اور درد و الم کو شفا میں تبدیل کر دیتی ہے۔ محبت تکلیف کو نعمت، قہر کو رحمت اور زنداں کو جنت بنا دیتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو لوہے کو نرم کرتی ہے، پتھر کو پگھلا دیتی ہے اور تنِ مردہ میں حیاتِ تازہ پھونک دیتی ہے۔" مشہور صحافی اور ادیب استاذ محمد زکی عبد القادر نے تمثیل کے پیرائے میں نفسانی رجحانات کا تذکرہ بدیں الفاظ کیا ہے "میں نے دور وسطِ بحر میں کچھ روشنیاں دیکھیں جیسے درخشاں ستارے ہوں اور خواہش کی کہ مجھے بھی مستقبل میں ایسا ہی چراغِ ہدایت میسر ہو اور ہم میں سے کون ہے جو اپنے مستقبل کو تابناک ستارے کی چمک سے محروم دیکھنا چاہتا ہے: تابناک ستارہ آنے والے دور میں رہنمائی کے لیے۔ بھلا وہ کیا ہو سکتا ہے؟ کیا حکمت و فلسفہ؟ مگر وہ کلامِ خشک کے علاوہ ہمیں کیا دے سکتا ہے؟ کیا حذر و احتیاط؟ مگر اس کے پاس ایک خوفِ مسلسل کے سوا اور ہے کیا؟ کیا عمل؟ مگر وہ تو اپنے دامن میں تعب اور مشقت ہی رکھتا ہے۔ یا پھر مال و دولت؟ نہیں وہ بھی نہیں وہ تو ان سب کا مجموعہ ہے۔ خوف، احتیاط، محنت، مصیبت۔ تو پھر مستقبل کا نجمِ تابندہ کسے قرار دیں؟ کیا محبت؟ ہاں ہاں بلاشبہ یہی وہ منفرد جوہر ہے جو ہمیں امن و امان اور سلامتی و عافیت

لہ یہ مضمون شیخ یوسف القرضاوی کی کتاب الحیاۃ والایمان کے ایک باب سے ماخوذ ہے۔

سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ محبت، ہر چیز سے محبت، ہر انسان سے محبت، ہر نعمت سے ہی نہیں ہر مصیبت سے بھی محبت۔ نعمت سے محبت جنگ و جدال کی گرمی کو کم کر دیتی ہے۔ اور مصیبت سے محبت اُس کا مقابلہ کرنے کی تاب و توانائی عطا کرتی ہے۔ کیا جملہ موجودات سے اِس نوعیت کی محبت کوئی کر سکتا ہے؟ کوئی نہیں۔ سوائے اُس شخص کے جس کے دل میں بشاشتِ ایمان گھر کر چکی ہو۔ ایمان ہی مصفّا اور مدام محبت کا خزانہ ہے۔ اور صرف مومن ہی خدا کی پیدا کردہ ہر چیز سے محبت کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ زندگی اور موت سے بھی۔

اللہ تعالیٰ کی محبت: ایمان سب سے پہلے انسان کے دل میں اللہ کی محبت پیدا کرتا ہے۔ وہ اللہ جو خلق و امر کا نقطۂ آغاز اور ایجاد و امداد کا مصدر ہے۔ جو خود جمیل ہے اور جس کی پیدا کردہ ہر چیز حسن و جمال کی آئینہ دار ہے۔ جو خود کامل و مکمل ہے اور جس کے مظاہرِ کمال، ذراتِ خاک سے لیکر سیارگانِ نور تک ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ اور ہر تشنۂ کمال اُسی کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہے۔ مومن اس لیے بھی اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے کہ لُطف و احسان کا سرچشمۂ اصلی وہی ہے۔ اور اپنے محسن سے محبت کرنا عین اقتضائے فطرت ہے۔ پھر سب سے بڑے محسن سے تو سب سے زیادہ محبت ہونی چاہیے۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَّبَاطِنَۃً ط (لقمان: ۲۰)	کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمان کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی ساری نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں۔

صاحبِ ایمان پر اللہ تعالیٰ کے جو اَن گنت احسانات ہیں ان کی بنا پر وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی ذات، اپنے اہل و عیال، اپنے والدین اور دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اللہ کی کتاب سے محبت کرتا ہے۔ جو نوعِ انسانی کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتی ہے۔ اللہ کے رسول سے محبت کرتا ہے جو رحمۃ للعالمین ہیں۔ اور ہر اُس انسان سے محبت کرتا ہے جو صاحبِ خیر و صلاح ہے کہ ان سب سے محبت تقاضائے ایمان ہے۔ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَاجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ۔

جملہ موجودات سے محبت اِس عالمِ مادی سے بھی مومن کا تعلق عداوت و نفرت کا نہیں بلکہ محبت کا تعلق ہے کیونکہ یہ عالم اُس کی نظر میں اللہ کی آیات کا ایک گنجینہ ہے۔ اُسے اِس عالم کی کوئی چیز بھی عبث اور فضول نظر نہیں آتی۔ وہ ہر شے میں کمال درجے کی حکمت و دانائی، حیرت انگیز توازن و تناسب اور بے نظیر تقدیر و تقسیم کا اہتمام دیکھتا ہے۔ وہ کھلی آنکھوں سے جب اس عالمِ طبعی کا مشاہدہ کرتا ہے تو یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہتا کہ ایک طرف گر

ہر چیز ذاتِ حق کی تسبیح و تحمید کر رہی ہے تو دوسری طرف خود انسان کے لیے مسخر ہو کر بزبانِ حال اسے خلافتِ ارضی کا اہل تسلیم کرتی ہے۔ ایسے عالم کو جس کا ذرہ ذرہ عظمتِ آدم کو خراجِ اطاعت پیش کر رہا ہے، مومن نظرِ حقارت کیوں دیکھے اور کیوں اس کی تباہی و بربادی کا خواہاں ہو۔

پھر یہ دُنیا اختلافِ احوال اور تغیر و تنوع سے عبارت ہے۔ اس کے تنوع اور تغیر کو بعض لوگ پسند نہیں کرتے۔ اور رات اور دن کے اختلاف سے اِلٰہ خیر کے ساتھ ساتھ ایک الٰہ شر کے وجود کا یقین کر لیتے ہیں جبکہ مومن ظلمت و نور کے تسلسل کو اللہ کی ایک بڑی نعمت اور اس کی توحید کی ایک بہت بڑی نشانی قرار دیتا ہے۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِلَیْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِیْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (القصص ۷۲، ۷۳)

(اے نبیؐ) ان سے کہو، کبھی تم لوگوں نے [illegible] یا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے دن طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کونسا معبود ہے جو تمہیں رات لا دے تاکہ تم اس سے سکون حاصل کر سکو۔ کیا تم کو سوجھتا نہیں۔ یہ اُس کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنائے تاکہ تم (رات میں) سکون حاصل کر سکو اور (دن کو) اپنے رب کا فضل تلاش کرو، تاکہ تم شکر گزار بنو۔

یوں اس عالمِ طبعی کے اختلافِ شب و روز کو ایک مومن جب اپنے لیے مفید اور سازگار پاتا ہے تو اُسے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ آب و گل کے اس جہان سے محبت نہ کرے۔

افلاک کے مسخر شدہ سیارے اور زمین کے منفعت بخش خطّے تو ایک طرف رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بعض اُن مقامات کو بھی اپنی محبت اور پسندیدگی کی سند عطا کی جہاں سے ظاہر بیں لوگ شگون بد لے سکتے تھے! امام بخاریؒ نے حضرت انسؓ بن مالک، خادمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ جب آپ خیبر گئے تو میں بھی بغرض خدمت آپ کے ساتھ تھا۔ واپسی پر آپ کو جبلِ اُحد نظر آیا تو آپؐ نے فرمایا: هٰذَا جَبَلٌ یُحِبُّنَا وَنُحِبُّهٗ۔ یہ وہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور اس سے ہم بھی محبت کرتے ہیں۔ غور فرمایئے کہ اس پہاڑ کی وہ کیا خصوصیت تھی جس کی بنا پر اس سے محبت کا ذکر کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس کے دامن میں لشکرِ اسلام کو شکست ہوئی تھی۔ رسولِ پاک خود زخمی ہو گئے تھے۔ اور ستّر کے لگ بھگ صحابہ کرام شہید ہو گئے تھے۔ اس ہزیمت کے باوجود محبت کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اسی خطۂ زمین کے پہلو میں مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا تھا کہ خدا و رسول کی اطاعت کے بغیر دنیا و عقبیٰ میں کامیابی

محال ہے۔ نصرتِ الٰہی حاصل نہ ہو تو محض ساز و سامان اور افراد کی طاقت اہلِ حق کو سربلند نہیں کر سکتی۔ پس مومن جب روئے زمین و اوجِ افلاک پہ ہر جگہ خدا کی آیات موجود پاتا ہے تو کائنات کے گوشے گوشے سے محبت کرنا یقینی ہو جاتا ہے۔

زندگی سے محبت | مومن زندگی سے بھی محبت کرتا ہے۔ وہ اسے گناہ سمجھتا ہے نہ جرم اور نہ دنیا میں آنے پر والدین کو کوستا ہے، نہ خدا کو۔ وہ حیاتِ دنیا کو اللہ تعالیٰ کی ایک امانت اور نعمت سمجھتا ہے جس کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔ حدیثِ نبوی ہے خیرالناس من طال عمرہٗ وحَسُنَ عملہٗ "خیر و سعادت سے سب سے زیادہ بہرہ ور وہ شخص ہے جس نے لمبی عمر پائی اور جسے اچھے کام کرنے کی توفیق ملی"۔ ایک اور حدیث میں ہے "تم میں سے کوئی موت کی آرزو نہ کرے۔ اور نہ اس کے آنے سے پہلے اس کی دعا کرے۔ کیونکہ جب آدمی مرجاتا ہے تو اُس کی مہلتِ عمل ختم ہو جاتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ مومن کے لیے عمرِ رواں خیر میں اضافہ ہی کا سبب ہوتی ہے۔ ایک اور مقام پر عمومی طور پر فرمایا "تم میں سے کوئی موت کی خواہش نہ کرے۔ کیونکہ اگر وہ نکوکار ہے تو ہو سکتا ہے اُس کی نیکی میں اضافہ ہو جائے اور اگر وہ غلط کار ہے تو ممکن ہے آنے والے وقت میں اُسے توبہ و انابت الی اللہ کی توفیق مل جائے"۔ ان ارشاداتِ رسولؐ سے ثابت ہوتا ہے کہ زندگی کو بہر صورت خیر ہی پر محمول کرنا چاہیے اور ایک صاحبِ ایمان کے لیے تو یہ فی الحقیقت سراپا خیر ہی ہے۔

موت سے محبت | مومن زندگی سے محبت اس لیے نہیں کرتا کہ دنیا کے ادنیٰ لذائذ و منافع سے وہ متمتع ہو رہا ہے۔ بلکہ اس لیے کرتا ہے کہ یہاں اسے حقوق اللہ ادا کرنے کا موقع ملتا ہے جس کے نتیجے میں موت کی سرحد پار کرتے ہی وہ اپنے رحیم و شفیق پروردگار سے ملاقات کی نعمت پاتا ہے۔ ایسی صورت میں بھلا وہ موت سے کیوں گھبرائے گا۔ وہ موت جس سے دیدارِ الٰہی نصیب ہو سکتا ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جب ابنِ ملجم نے مہلک وار کیا تو آپ کی زبان فیض ترجمان سے یہ الفاظ نکلے : "فُزْتُ بربِّ الکعبہ" رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ ایسے مواقع پہ کوئی بات بنائی نہیں جا سکتی۔ بلکہ بے اختیار اُس حقیقت کا اظہار ہو جاتا ہے جو انسان کے دل و دماغ اور رگ و پے میں سرایت کر چکی ہو۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وقتِ وفات آیا تو اُن کی اہلیہ محترمہ کی چیخیں نکل گئیں اور "واکرباہ واکرباہ" (ہائے مصیبت) کہنے لگیں۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے سنا تو فرمانے لگے "واطرباہ! واطرباہ!" (واہ واہ) کیوں نہیں کہتی۔ وفات کے فوراً بعد میں اپنے پیاروں سے ملاقات کرنے والا ہوں۔ محمدؐ رسول اللہ سے اور ان کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے حضرت

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جب ایران و روم کے سپہ سالاروں سے خط و کتابت کرتے تو انہیں لکھتے "اسلام قبول کر لو۔ سلامتی پاؤ گے۔ بصورتِ دیگر میں تمہاری طرف ایک ایسی فوج روانہ کروں گا جو موت سے اتنی ہی محبت کرتی ہے جتنی محبت تم حیاتِ دنیا سے کرتے ہو۔"

ابنائے نوع سے محبت | اہلِ ایمان تمام لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے بندے اور آدم علیہ السلام کی اولاد ہونے میں سب یکساں ہیں۔ سب ایک دوسرے سے رحم و نسب کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ سب کا مقصدِ حیات (خدا کی بندگی و عبادت) ایک ہے اور ایک ہی سب کا دشمن ہے یعنی شیطان۔ اس ہمہ گیر اشتراک کا تقاضا ہے کہ عالمِ انسانیت سے تعلقاتِ محبت استوار کیے جائیں۔ ان تعلقاتِ محبت کو استوار کرنے کے لیے اسلام نے توحید، رسالت اور اخوتِ انسانیت کے عقاید دیئے ہیں امام احمدؒ اور ابو داؤدؒ نے حضرت زیدؓ بن ارقم کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے بعد یہ دعا کیا کرتے تھے:

اللھم ربنا ورب کل شیء وملیکه انا شهید انك الرب وحدك لا شريك لك اللھم ربنا ورب كل شيء انا شهيد ان محمداً عبدك ورسولك: اللھم ربنا ورب كل شيء انا شهيد ان العباد كلهم اخوة۔	"اے اللہ ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار اور بادشاہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو اکیلا ہی پروردگار ہے اور تیرا کوئی شریک نہیں۔ اے اللہ ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار میں گواہ ہوں کہ محمد تیرا بندہ اور رسول ہے اے اللہ ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار میں اس امر کی شہادت دیتا ہوں کہ تمام بندے بھائی بھائی ہیں۔"

سرورِ کونین کے ان دعائیہ کلمات سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ نوعِ انسان کی اخوت و محبت کوئی ضمنی حیثیت رکھنے والا مسئلہ نہیں بلکہ توحید و رسالت جیسے بنیادی عقائد کی طرح بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

رنگ، نسل، زبان اور علاقائی بنیاد پر قائم ہونے والے تمام امتیازات بھی اسلام نے اسی لیے کالعدم قرار دیئے ہیں کہ ان کے موجود رہتے ہوئے نوعِ انسانی میں تفرقے کے رجحانات تو پیدا ہو سکتے ہیں محبت کے جذبات نہیں۔ اسلام کا یہ نظریہ کہ کلکم من آدم و آدم من تراب "تم میں سے ہر ایک کا باپ آدم ہے اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے"، ایک طرف اگر اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ انسانوں میں اونچ نیچ اور ذات پات کے تصورات منافی اسلام ہیں تو دوسری طرف محبتِ نوع کا منہ بولتا ثبوت بھی ہے۔

خدا کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے اپنے ابنائے نوع سے محبت، ایک مومن کی نظر میں کیسا کچھ مسلّم

اور مؤکد امر ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ اسلام میں من حیث الکل تمام انواعِ مخلوقات کا احترام کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ مفید اور ضروری قسم کے جانوروں سے ہی نہیں، وحوش و طیور، حشرات الارض حتیٰ کہ نجس اور پلید جانوروں تک سے حسنِ سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔ کسی ذی روح کو مزے لے لے کر اور تڑپا تڑپا کر مارنا جائز نہیں، چاہے وہ کتنا ہی مہلک اور ضرر رساں کیوں نہ ہو۔ کسی حلال جانور کو خدا کا نام لے کر بھی کند چھری سے ذبح کرنا ممنوع ہے۔ کسی چوپائے کو بھوکا پیاسا رکھنا ناجائز ہے۔ بلا ضرورت کسی درخت کی شاخ تک کاٹنا پسندیدہ نہیں، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر کُتّے خدا کی تخلیق میں ایک نوع نہ ہوتے تو میں ان سب کو قتل کرنے کا حکم دے دیتا"۔ یہ ارشادِ رسولؐ اور جانوروں سے متعلق دیگر احکامِ اسلام ہمیں یہی سکھاتے ہیں کہ خدا کی تمام مخلوقات کے لیے ہمارے دل میں احترام، محبت اور رحم کے جذبات پیدا ہوں۔ اس کے بعد انسانوں سے محبت کرنا کتنا ضروری ہے کچھ زیادہ محتاجِ وضاحت نہیں رہتا۔

<u>مومن کا سینہ حسد و بغض سے پاک ہوتا ہے</u> | محبت کا سب سے پہلا اثر جو مومن کا دل قبول کرتا ہے وہ حسد و بغض سے بیزاری ہے۔ اس کے نورِ ایمان سے منوّر سینے میں بدی و بدخواہی کی تاریکی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ وہ بہرحال خیر کا طالب ہوتا ہے اپنے لیے بھی اور دوسرے تمام لوگوں کے لیے بھی۔ وہ جو خدا سے بھی راضی ہوتا ہے اور مخلوق سے بھی محبت کرتا ہے، اس کے عقیدۂ رضا و محبت میں آخر حسد و بغض کس طرف سے داخل ہو سکتے ہیں۔ وہ کسی کو خوشحال و کامراں دیکھ کر حسد کرے تو کس بنیاد پر؟ کیا خدا کی تقسیمِ رزق پر معترض ہو۔ یا اس انسان کی تباہی و بربادی کا خواہاں؟ مگر یہ دونوں کام اس کے دین و ایمان سے مغایرت رکھتے ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ کا قول ہے: "اے ابنِ آدم تو اپنے بھائی سے حسد کیوں کرتا ہے۔ اللہ نے جو کچھ اسے دیا ہے اگر وہ اُس کا فضل و کرم ہے تو تو ایسے آدمی پر حسد کیوں کرتا ہے جس کی عزت و تکریم کا خود خدا متمنی ہے۔ اور اگر وہ خدا کا فضل و کرم نہیں کچھ اور ہے تو تجھے اُس کے دوزخ کی طرف جانے پر حسد کیوں ہے"؟ ابنِ سیرینؒ نے فرمایا "میں نے دنیا کے مال و متاع کو دیکھ کر کسی آدمی پر کبھی حسد نہیں کیا۔ اگر وہ اہلِ جنت میں سے ہے تو اس کی دنیوی آسودگی سے حسد کرنا فضول ہے کہ جنت کے مقابلے میں دنیا کی حقیقت ہی کیا ہے۔ اور اگر وہ دوزخ کا ایندھن بننے والا ہے تو اس بدنصیب کے اس انجام کا خیال کر کے میں اُس کی دنیا پر کیسے حسد کر سکتا ہوں؟

یہی حال بغض اور کینے کا ہے۔ وہ اہلِ ایمان جو معاف کرنے میں لذت محسوس کرے جو انتقام پر قادر ہو اور بدلہ لینے کا حق رکھتا ہو مگر نہ لے۔ جس کی نظر میں بغض رکھنا اللہ کی رحمت سے دُور رہنا ہو۔ وہ کسی کا

بُرا کیوں چاہے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہر سوموار اور جمعرات کو انسانوں کے اعمال بارگاہِ الٰہی میں پیش کیے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اسی دن ہر اُس شخص کی مغفرت فرما دیتے ہیں جو شرک نہ کرتا ہو۔ سوائے اُن دو حضرات کے جو باہم بغض میں مبتلا ہوں۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے اعمال کا بار ان پر ہی رہنے دو تا آنکہ یہ دونوں آپس میں صلح کر لیں" آپؐ نے یہ بھی فرمایا "اُس وقت تک مومن کا ایمان مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی شے پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ اور جب تک اپنے بھائی کے لیے اُس چیز کو ناگوار نہ سمجھنے لگے جسے وہ اپنے لیے ناگوار محسوس کرتا ہے" ان احادیثِ پاک میں جن محاسن کو سمویا گیا ہے کیا جذبۂ محبت کے بغیر عملی زندگی میں انہیں فروغ دیا جا سکتا ہے۔ اور یہ جذبہ انسان کے دل میں ایمان کی بدولت ہی پرورش پاتا ہے۔

ایثار و قربانی، اہلِ ایمان کی خصوصیت ہے محبت کا بلند ترین درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات پر اپنے بھائی کو ترجیح دے۔ اور اس کی ضرورت کو مقدم سمجھے۔ وہ خود بھوکا پیاسا رہ لے لیکن اپنے بھائی کی شکم سیری کا اہتمام کرے۔ خود مشقت اٹھا لے مگر اپنے بھائی کے لیے راحت کا سامان ہی مہیا کرے۔

مگر محبت کا یہ بلند کردار اسی وقت سامنے آتا ہے جب اُس کے پیچھے ایمان کی طاقت موجود ہو۔ مکہ اور عرب کے دیگر مقامات سے خدا اور اس کے رسول پہ ایمان رکھنے والے مدینہ کی طرف ہجرت کرتے ہیں۔ مال و اسباب سے لدے ہوئے نہیں بلکہ لُٹے پٹے یہ راہِ حق کے راہی جب مدینہ منورہ پہنچتے ہیں تو انصار انہیں خوش آمدید کہتے ہیں اس وقت رسولِ پاک نے مہاجرین کی بحالی کا مسئلہ اس طرح حل کیا کہ ایک ایک مہاجر کو ایک ایک انصاری کا بھائی قرار دے دیا۔ اس مواخات کے بعد انصار نے مہاجرین کو رہنے کے لیے اپنے مکانات دیئے، کام کاج کے لیے اپنے وسائل مہیا کیے۔ اپنی زمینوں اور اپنے اثاثوں کی پیش کش کی۔ اور یک دل و یک جان ہو کر گذر بسر کرنے لگے۔ غور فرمایئے اس ایثار و قربانی اور اخوت و محبت کی بنیاد کیا چیز تھی؟ کیا کوئی خون کا تعلق؟ نہیں۔ کیا رنگ، زبان اور علاقے کا اشتراک؟ نہیں۔ یہ عرب اور بیرونِ عرب سے تعلق رکھنے والے لوگ جن میں سیاہ فام بھی تھے سفید فام بھی قریشی بھی اور اوس و خزرج کے قبائل کے لوگ بھی۔ کوئی شمالی عرب کا باشندہ تھا تو کوئی جنوبی عرب کا بعض یمنی اور حجازی تھے تو بعض رومی اور فارسی۔ بہت سے غریب تھے اور کئی ایک امیر۔ تاجر پیشہ بھی تھے کاشتکار بھی اور ایک بڑی تعداد اُجرت پہ کام کرنے والوں کی بھی تھی۔ ان میں قدرِ مشترک صرف ایک چیز تھی ——— ایمان ——— اور اسی کے نتیجے میں اخلاص و ایثار کا بے نظیر مظاہرہ ہوا کہ رسول اللہ نے فرما دیا تم سب بھائی بھائی ہو اور وہ بھائی بھائی بن گئے، حقیقتاً بھائی۔ دنیا کے

بھائیوں سے زیادہ گہرے اور ایثار پیشہ بھائی۔ ہر ایک محبت کا پیکر اور اخوت کا مجسمہ۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے اور سعدؓ بن ربیع خزرجی کے درمیان تعلقِ اخوت قائم کر دیا۔ سعد مجھے گھر لے گیا اور کہا: میں انصار میں سب سے زیادہ مالدار ہوں۔ یہ لیجیے میرا نصف مال حاضر ہے اور دیکھیے میری دو بیویاں ہیں ان میں سے جس کو پسند کرو۔ آپ کے لیے اس سے جدائی اختیار کر لیتا ہوں۔ حلال ہونے پر آپ اس سے نکاح کر لیں۔ اس مخلصانہ ایثار کا جواب حضرت عبدالرحمٰنؓ فرماتے ہیں میں نے یہ دیا کہ اللہ آپ کے گھربار اور مال و دولت میں برکت دے یہ سب کچھ آپ اپنے ہی پاس رکھیں، مجھے صرف بازار کا راستہ بتا دیں تاکہ تجارت کر سکوں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی انصار کے بے پناہ ایثار کو سراہتے ہوئے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر: ۹)

(اور یہ اموالِ فے) ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو مہاجرین کی آمد سے پہلے ایمان لا کر دارالہجرت میں مقیم تھے۔ یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں۔ اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔

محبت کے زیر اثر بغض و کراہت کا وجود اس میں کچھ شک نہیں کہ ہر انسان میں جذبۂ محبت کے علاوہ بغض کا بھی کچھ نہ کچھ عنصر ضرور موجود ہوتا ہے۔ اور وہ کسی نہ کسی صورت میں خروج کے راستے تلاش کرتا رہتا ہے۔ ایمان نے جذبۂ محبت کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ بغض و کراہت کے منفی جذبات کو بھی مثبت مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا ہے۔ اور یوں منفی جذبات کے خروج کے لیے خود راستہ مہیا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں: اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا "شیطان تمہارا دشمن ہے اسے دشمن ہی سمجھو"۔ مزید فرمایا: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ "۔ اور جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔ ان شیطان کے ساتھیوں سے خوب جنگ اور قتال کرو (النساء: ۷۶) مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے خلاف بغض رکھنا ہے تو شیطان سے رکھو، اس کے حواریوں سے رکھو اور ان سے جنگ بھی کرو لیکن کسی خدا کے پرستار اور صداقت کے علمبردار سے نہیں۔ یہاں یہ امر واضح رہے کہ شیطان یا اس کے کسی پیرو سے بھی بغض بحیثیت ایک شخصیت کے جائز نہیں۔ نہ کسی عصبیت کے زیر اثر درست ہے۔ بغض اس کی گمراہی و ضلالت سے ہو۔ اس کے

دجل وفریب سے ہو۔ وہ راہِ راست سے روکے اور حق سے منحرف کرے تو پھر ہو۔ یہی مفہوم ہے اُس حدیثِ نبوی کا جس میں آپؐ فرماتے ہیں: "جس نے اللہ کے لیے محبت کی، اللہ کے لیے بغض رکھا، اللہ کے لیے دیا اور اللہ کے لیے دیا اور اللہ کے لیے روکا اُس نے اپنے ایمان کی تکمیل کرلی۔

مذکورہ بالا گذارشات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عقیدۂ اسلام پہ ایمان رکھنے والا ہی دراصل اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتا ہے۔ زندگی اور موت اور تقدیر کے خیر وشر سے محبت کرتا ہے۔ تمام انسانوں سے اور جملہ موجودات سے محبّت کرتا ہے اور اگر کسی چیز کی طرف سے اُس کے دل میں کراہت پیدا ہوتی ہے یا کسی کے خلاف وہ بغض رکھتا ہے تو وہ بھی یا تو رحمت وشفقت ہی کی بنا پر ہوتا ہے یا شیطان جیسی خیر سے یکسر عاری مخلوق سے متعلق۔ محبت کا یہ وسیع مفہوم صرف ایمان کا پیدا کردہ ہے۔ اور آدمی کے ایمان کی دلیل بھی۔ سچ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے: "اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم ہرگز جنت میں داخل نہ ہوگے جب تک باایمان نہ بن جاؤ۔ اور تم کبھی باایمان نہیں بن سکتے جب تک آپس میں محبّت نہ کرو۔

مطبوعات

اسباق النحو مرتبہ: جناب خالد مسعود، ناشر حلقہ تدبرِ قرآن سمن آباد لاہور۔ قیمت ۳/۵۰ روپیہ۔ صفحات: ۱۴۲ کاغذ سفید اور کتابت وطباعت آفسٹ۔

زبانِ عربی —— جو قرآنِ پاک اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہے —— کی تعلیم و اشاعت میں گہری دلچسپی لینا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ عربی کے اصول و قواعد کو اُردو میں عام فہم بنا کر پیش کیا جائے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو مولانا حمید الدین فراہی مرحوم کی کتاب کو بنیاد بنا کر مرتب کی گئی ہے۔ اُردو داں طبقہ کے لیے پیشتر ازیں متعدد اہلِ علم کی کوششیں ہمارے سامنے آئی ہیں جو بجائے خود بہت مفید ثابت ہوئی ہیں لیکن چونکہ عربی زبان قدرے دقیق ہے اور اس کی گرامر کے بعض مراحل طلبہ کے لیے حوصلہ شکن بھی ہیں، بنابریں ابھی اس میدان میں بہت کچھ کام کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

اسباق النحو بلاشبہ آگے کی طرف اُٹھنے والا ایک قدم ہے۔ اس کی ترتیبِ مباحث اور اندازِ بیان نیا ہے اور جدید ذہن کے لیے مانوس۔ سب سے پہلے اسم کو لیا گیا ہے۔ اس کی اقسام اور اعرابی حالات بیان کرنے کے بعد فعل کا ذکر ہے۔ جو ثلاثی مجرد کے ابوابِ فعل کی اقسام، معتلات و خاصیاتِ ابواب وغیرہ تمام ضروری باتوں کو محیط ہے۔ سب سے آخر میں حروف کا بیان ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کا اختصار اور جامعیت ہے۔ جامعیت ان معنوں میں تو ہے کہ علم النحو کے تقریباً تمام ضروری گوشے اس میں آگئے ہیں لیکن یہ بات کہ "تشنہ مباحث کے لیے طلبہ کو کسی دوسری کتاب کی طرف رجوع نہیں کرنا پڑے گا" محلِ نظر ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں متعدد مباحث تشنہ ہیں مثلاً مضاف الیہ کی بحث اور توابع کے تحت صفت کا بیان وغیرہ۔ کتاب کا بہت زیادہ اختصار بھی اس کی افادیت کو کہیں کہیں متاثر کرتا نظر آتا ہے۔ خاص طور پر فعل سے متعلق وہ بحثیں جو تعلیلات پر مشتمل ہیں انہیں تو استاد کی مدد کے بغیر بہت کم طلبہ سمجھ سکتے ہیں۔ تاہم بحیثیتِ مجموعی اسباق النحو ایک مفید کاوش ہے جو تسہیلِ زبانِ عربی اور فہمِ قرآن و سنت کے لیے بہت کچھ مددگار ثابت ہوگی۔

(بقیہ اشارات)

دفعتاً سبکدوش کر دیئے گئے۔ اب مستقل دستور کے لیے جو مسودہ سامنے آیا ہے اس میں بھی سرکاری ملازمین کے تحفظ کا کوئی انتظام موجود نہیں۔ بلکہ یہ بات مقننہ کے صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہے کہ آئندہ چل کر وہ ملک کا نظم و نسق چلانے والوں کے بارے میں جس قسم کا قانون چاہے بنا دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سرکاری ملازمین کو کلیتہً پیپلز پارٹی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ ان کی قسمت کا جو فیصلہ کرنا چاہے بلا روک ٹوک کرے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر کیا اس بات کا کوئی معمولی امکان بھی باقی رہ جاتا ہے کہ کوئی سرکاری ملازم کسی ایسے اقدام کی جرأت کرے گا جو اگرچہ اُس کے ضمیر اور ایمان کے عین مطابق ہو مگر پیپلز پارٹی کی رضامندی کے خلاف ہو۔ اس قسم کی جرأتِ رندانہ تو وہی ملازم کر سکتا ہے جس کی نظر میں ضمیر اور ایمان کی قیمت دنیا کی ہر چیز سے زیادہ ہو اور وہ اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے پر بھی آمادہ ہو۔ آخر ہماری انتظامیہ میں کتنے فیصد لوگ اس مضبوط سیرت کے مالک اور اپنے ایمان اور ضمیر کے معاملے میں اس قدر حساس اور اس کے تحفظ کے لیے اس حد تک ایثار کرنے کے لیے تیار ہیں کہ ملازمت اور دوسرے دنیوی مفادات کو تو بلا تکلف ٹھکرا دیں مگر ضمیر اور ایمان پر آنچ نہ آنے دیں۔ جو افراد اس وقت انتظامیہ سے وابستہ ہیں اُن کی اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو ملازمت چھن جانے کے خوف سے پیپلز پارٹی کی ہر جائز و ناجائز خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ انتظامیہ کو اپنی مٹھی میں لیکر صدر بھٹو اور اُن کے رفقاء کار اپنے لیے اور اپنی پارٹی کے لیے جس قسم کے مفادات حاصل کریں گے اس کا اندازہ ایک سال کے اندر ہی بخوبی ہو گیا ہے۔ لیکن اس قسم کی انتظامیہ کی حقیقی افادیت انتخابات کے وقت پوری طرح کھل کر سامنے آئے گی جب اس کے سارے اعضاء و جوارح حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حکمراں پارٹی کے نمائندوں کو کامیاب بنانے کے لیے تگ و دو کریں گے اور وہ جب دوبارہ مسندِ اقتدار پر فائز ہو جائیں گے تو پھر اپنے انعام کے طالب ہونگے۔ کیا انتظامیہ کی ان کھلی دھاندلیوں کے باوجود کوئی دوسری جماعت اسمبلی میں اکثریت حاصل کر سکے گی؟ اور کیا انتخابات کے اس ڈرامے کے باوجود ملک کے اندر یک جماعتی حکومت قائم کرنے میں کوئی چیز مانع ہو گی؟

پیپلز پارٹی اس ملک میں اپنی آمریت مسلط کرنے کے لیے کس قدر بیتاب ہے اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ دستور کے ذریعے تمام شہریوں کے سر پر یہ تلوار معلق کر دی گئی ہے کہ اُن کی جائداد

ہر وقت بھی سرکار ضبط کی جا سکتی ہے۔ اپنے آمرانہ عزائم پر پردہ ڈالنے کے لیے یوں تو کہا یہ گیا ہے کہ جائداد تین مقاصد کے لیے ضبط کی جائیگی، تعلیم، صحت اور ناداروں کو مکانات مہیا کرنے کے لیے۔ لیکن اس ملک کا ہر شہری اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ یہ عوام کو بے بس بنانے کا مجرب نسخہ ہے اور تعلیم کی اشاعت، صحت کی بحالی اور غریبوں کی ہمدردی کے نام پر اُن لوگوں کو ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنایا جائے گا جو حکومت کی نظر میں کسی وجہ سے کھٹکتے ہوں۔ برسر اقتدار پارٹی حکومت کے اس حق کی تائید میں یہ کہتی ہے کہ حکومت اپنے اس اختیار کے ذریعے ناجائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کو عوامی فلاح و بہبود کے لیے حاصل کر سکے گی۔ یہ دونوں مقاصد بلاشبہ بڑے نیک ہیں۔ حرام ذرائع سے کمائی ہوئی دولت نے ہمارے معاشرے کو تباہ کر دیا ہے۔ اس بنا پر جن لوگوں نے ناجائز ذرائع سے مال اکٹھا کیا ہے نہ صرف اُن سے مال لے لینا ضروری ہے بلکہ انہیں سزا دینا بھی ضروری ہے تاکہ عوام ان لوگوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ ہو سکیں گے۔ لیکن جو مسوّدۂ دستور سامنے آیا ہے اس میں ان ناجائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کے ضبط کرنے کا کوئی ضابطہ اور اصول مقرر نہیں کیا گیا تاکہ ایک طرف تو حرام کمائی کرنے والے قانونی گرفت کے خوف کی وجہ سے اپنی روش تبدیل کریں اور دوسری طرف عوام کے اندر اطمینان پیدا ہو کہ حکومت اب عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے پر تُل گئی ہے۔ مسودہ دستور میں جس انداز سے جائداد کے ضبط کرنے کا تذکرہ کیا گیا ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنی جائداد پر مالکانہ حقوق حکومت کی نظرِ کرم کی وجہ سے حاصل ہونگے۔ جو لوگ حکومت کے حاشیہ نشین ہونگے اُن کی جائدادیں خواہ وہ کس قدر ناجائز ذرائع سے حاصل کی گئی ہوں اُن کے حق میں ہر طرح سے محفوظ رہیں گی لیکن جو لوگ حکومت کی نظر میں کسی وجہ سے ناپسندیدہ ہوں گے اُن کی جائدادیں بحق سرکار ضبط کر لی جائیں گی۔

اس مسودۂ دستور میں جو چند اسلامی دفعات شامل ہیں اُن کے بارے میں یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتی ہے کہ اُن کی حیثیت محض زیبِ داستاں کی سی ہے۔ اسلام کو مملکتِ پاکستان کا دین تو تسلیم کیا گیا ہے اور قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی کو ممنوع بھی قرار دیا گیا ہے لیکن اس ضمن میں نہ تو اسلامی کونسل اور نہ کسی عدالت کو یہ اختیار عطا ہوا ہے کہ کسی قانون یا کارروائی کو قرآن و سنت کے خلاف ہونے کی بنا پر روک سکے یا کالعدم قرار دے سکے، اور نہ کسی شہری کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ کسی عدالت یا ذمہ دار

ادارے کے روبرو اس سوال کو اٹھا سکے۔ اسلامی دستور کے معاملے میں لوگوں کے احساسات کو سامنے رکھتے ہوتے انہیں یہ کہکر بہلایا گیا ہے کہ مشاورتی کونسل جو آئین کے مرتب ہونے کے تین ماہ کے اندر قائم کی جائے گی، سات سال کے اندر اپنی رپورٹ پیش کریگی کہ قرآن وسنت کے نفاذ کے لیے کیا قانون پاس ہو اور پھر یہ رپورٹ چھ ماہ کے اندر اسمبلی میں پیش کی جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آٹھ سال کا عرصہ تو اس بات پر غور کیے بغیر کہ اسلام ہم سے کچھ تقاضا بھی کرتا ہے، بآسانی گذر جائے گا۔ اس کے بعد اس کے ان تقاضوں کی طرف سرکار عالی مدار توجہ دے گی۔ اس مسودۂ دستور کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس میں صدرِ مملکت کو جو ہر حال میں وزیر اعظم کے مشورے کا پابند ہوگا، حدود اللہ کو ساقط کر دینے کا اختیار بھی دیا گیا ہے اور سود، شراب، جوئے، زنا جیسے منکرات اور فواحش پر واضح پابندی لگانے کے بجائے ان کے سدباب کو انتظامیہ کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

ہم اپنے ملک کی حکمران پارٹی سے بڑے خلوص کے ساتھ یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ نشۂ اقتدار میں مست ہو کر نہیں بلکہ ٹھنڈے دل ودماغ کے ساتھ اس مسودۂ دستور پر اسلام اور جمہوریت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے غور کرے اور اس بات کا جائزہ لے کہ اس دستور کے نفاذ کے بعد کیا دنیا ہمارے اس دعوے کو باور کرتے پر تیار ہو گی کہ یہ ملک اسلامی جمہوریہ ہے۔ کیا خلق خدا ہمارے اس مکر وفریب پر خندہ زن نہ ہو گی اور کیا کائنات کا خالق اور مالک اور اس کے فرشتے ہماری ان چالاکیوں اور عیاریوں کی وجہ سے ہم پر لعنت نہ بھیجیں گے؟

تفہیم القرآن

جلد دوم

"تفہیم القرآن" جلد پنجم اور جلد ششم کے بعد ادارہ "جلد دوم"

(سورۃ الاعراف تا سورۃ بنی اسرائیل)، اپنے مخصوص معیار

کے مطابق شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

آج ہی "جلد دوم" کے حصول کے لیے اپنے قریبی تاجر کتب

سے رجوع فرمائیں یا براہِ راست ہمیں تحریر کریں۔

دلکش کتابت۔ دیدہ زیب طباعت۔ سفید کاغذ۔ رنگین نقشہ جات

خوبصورت جلد — ہدیہ: تیس روپے ۳۰/-

— ناشر —

ادارۂ ترجمان القرآن۔ اچھرہ لاہور